ماہنامہ نعت لاہور
شہیدانِ ناموسِ رسالت ﷺ
KHALID

ماہنامہ **نعت** لاہور

جلد ۴ — اپریل ۱۹۹۱ء — شمارہ ۴

شہیدانِ ناموسِ رسالت

(حصہ چہارم)

ایڈیٹر: راجا رشید محمود

مشیرِ خصوصی: چوہدری رفیق احمد باجوہ ایڈووکیٹ

معاون: شہناز کوثر

خطاط: جمیل احمد قریشی تنویر رقم
خلیل احمد نوری

قیمت ۱۵ روپے (فی شمارہ)
۱۶۰ روپے (زرِ سالانہ)

منیجر: اظہر محمود

پرنٹر: حاجی محمد نعیم کھوکھر۔ جیم پرنٹرز۔ لاہور

پبلشر: راجا رشید محمود

بائنڈر: خلیفہ عبدالمجید۔ بک بائنڈنگ ہاؤس، ۳۸۔ اردو بازار۔ لاہور

اظہر منزل مسجد سٹریٹ نمبر ۵۔ نیو شالامار کالونی۔ ملتان روڈ

لاہور (پاکستان) پوسٹ کوڈ ۵۴۵۰۰

(منظر رقم)

فون: ۴۱۳۶۸۴

باسمہٖ سبحانہٗ وتعالیٰ

شہیدانِ ناموسِ رسالت!
شاتمانِ رسول ﷺ کے دشمن،
استقامت کے تراشے ہوئے پیکر،
ایمان کی تجسیم کے مکمل شاہکار،
جنھوں نے جذبوں کی ثقاہت کو دار کی کسوٹی پر کس کے دیکھ لیا۔

شہیدانِ ناموسِ رسالت!
شماتتِ سرکار (صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم) کی کسی خبر سے جن کا رُواں رُواں سرکشیدہ نظر آیا،
اُنھوں نے ضروری کارروائی کی تو شماتت کی ہر جسارت سرنگوں ہوئی اور حفاظتِ حُرمت کی کوشش سربلند ٹھہری!

شہیدانِ ناموسِ رسالت!
جن کے ایثار پیشہ سراپا میں وہ خون پایا گیا جس کا گروپ غیرت ہے
یہ خون ان کی رگوں میں دوڑتا پھرتا اس لیے رہا کہ کسی کام آئے۔
غیرت گروپ کا یہ خون پہلے اُچھلا اور بے غیرتی کے مجسّموں کو دبوچ لیا، پھر اُبلا اور شہادت کو گلے لگا لیا۔
خون کا غیرت گروپ ـــ دُنیا کی عظمتیں جس کی حیثیت کے سامنے سرفگندہ بیٹھی ہیں اور عقبیٰ کی نعمتیں اس کے خیر مقدم کو سروقد کھڑی ہیں۔
مرحبا، غیرت گروپ، صد مرحبا!!

فہرست

منظومات

لاہور و کراچی

(غازی علم الدین شہیدؒ اور غازی عبد القیومؒ شہیدؒ
کے کارناموں کے حوالے سے)

نظر اللہ پہ رکھتا ہے مسلمانِ غیور
موت کیا شے ہے؟ فقط عالمِ معنی کا سفر

ان شہیدوں کی دیت اہلِ کلیسا سے نہ مانگ
قدر و قیمت میں ہے خوں جن کا حرم سے بڑھ کر

آہ! اے مردِ مسلماں تجھے کیا یاد نہیں
حرفِ لَا تَدْعُ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا آخَر

حکیم الامت علامہ محمد اقبالؒ

(ضربِ کلیم - ص ۵۶)

غازی عبد القیومؒ شہیدؒ

جنھوں نے نتھو رام کی گندی زبان کو ہمیشہ کے لیے بند کر دیا

تحریر: رائے محمد کمال

روایت ہے کہ سرکارِ مدینہ (صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم) اپنے جاں نثار صحابہؓ کے جھرمٹ میں ہوتے تو اکثر آپ کا رُخِ انور ہندوستان کی جانب رہتا اور فرماتے اس سمت سے آنے والی ہوا عقیدت و احترام اور عشق و مستی کا پیغام لاتی ہے۔ علامہ اقبال مرحوم و مغفور اسی حدیثِ مبارکہ کا مضمون اپنے رنگ میں یوں باندھتے ہیں۔

میرِ عربؐ کو آئی ٹھنڈی ہوا جہاں سے
میرا وطن وہی ہے، میرا وطن وہی ہے

میں ارشادِ نبوی (صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم) کے اس دریائے لطف و کرم میں غوطے کھا رہا تھا۔ روح میں یکایک یہ مقدّس تمنّا اُبھر آئی کہ فرمانِ رسالت پناہ (صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم) کی تہ میں پنہاں موتی ڈھونڈنے چاہییں۔ اعتکافِ فکر میں تاریخ کا حجاب اُٹھ گیا ـــــ یہ میں اور یہ نصیب ..... آقا و مولا (علیہ التحیۃ والثناء) کا الطافِ پیہم ہی تو ہے جس نے قسمت جگائی اور میں بارشِ رحمت میں نہاتا، راولپنڈی سے گزرتا ٹیکسلا کینٹ کو پیچھے چھوڑتا، تربیلا روڈ پھلانگتا ایک قصبہ "غازی"، تحصیل ہری پور ضلع ایبٹ آباد میں جا پہنچا۔ یہ دُور افتادہ بستی غازی عبد القیوم شہیدؒ کا آبائی مسکن ہے۔ وہ نوجوان شہیدِ رسالتؐ جن کا جوش و ولولہ کیف و سرور، سوز و ساز، راز و نیاز اور جذبۂ سرفروشی مرقومہ بالا نطقِ نبوّت کی عملی تفسیر بن گیا ـــــ میں نے حافظ آباد سے یہ جست ۲۴ر اکتوبر ۱۹۸۸ء کو ہری پور کی طرف لگائی لیکن محبوبِ خدا، مولائے انبیاءؑ (صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم) کی عزّت و ناموس کے اس لاڈلے محافظ کا سفرِ عقیدت ۲۰ر ستمبر ۱۹۳۴ء کو کراچی میں شروع ہوا۔ اس روز ڈی این او سلیوان ایڈیشنل جوڈیشنل کمشنر پر مشتمل بنچ مرافعۂ فوجداری کی اپیلیں سماعت کر رہا تھا۔ سندھ

کا بدنام آریہ سماج لیڈر نتھورام جس کو اپنی رسوائے زمانہ کتاب "تاریخ اسلام" کے سلسلہ میں پیشی بھگتنا تھی، وہ بھی کمرۂ عدالت میں ایک طرف بیٹھا مسلمانوں کی قانونی چارہ جوئیوں پر طنزاً خندہ زن تھا۔ تفصیل اس کی یہ ہے کہ کتاب مذکور میں ملزم نے پیغمبر علیہ التحیۃ والثناء کی شان میں زبردست گستاخی کی اور آپؐ کی ذات اقدس کو سوقیانہ انداز میں نشانۂ سبّ وشتم بنایا۔ اس گستاخانہ تحریر کے جرم میں اس کے خلاف مقدمہ دائر کیا گیا۔ سیشن کورٹ حیدر آباد کی عدالت سے آٹھ ماہ قید سخت کی سزا دی گئی۔ نتھورام نے فیصلہ کے خلاف اپیل گزاری اور وہ ضمانت پر رہا کر دیا گیا۔ آج کے دن وہ کچہری میں حاضر اپنی باری کا انتظار کر رہا تھا کہ اس کے مقدمہ کی سماعت ہو مگر شمعِ رسالتؐ کا ایک غیور پروانہ نعرۂ تکبیر بلند کرتا ہوا آگے بڑھا اور کمینہ فطرت شاتمِ نبیؐ کا کام تمام کر دیا ـــــ غازی صاحبؒ پٹھان برادری سے تعلق رکھتے تھے۔ آپ کے والد کا نام عبداللہ خان اور والدہ کا اسمِ گرامی جنّت بی بی تھا۔ موصوف نے فقط چار جماعتوں تک تعلیم حاصل کی۔ شباب کی دہلیز پر قدم رکھا تو "دریانی خانم" ایک پاکباز اور خوبصورت دوشیزہ سے رشتۂ مناکحت میں منسلک ہو گئے مگر غمِ معاش نے چین نہ لینے دیا۔ ابھی شادی خانہ آبادی کو دو ماہ ہی گزرے تھے کہ تلاشِ روزگار میں کراچی جانا پڑ گیا۔ غازی صاحب کے قریبی دوست اور چچازاد بھائی محمد عرفان خان نے راقم الحروف کو انٹرویو کے دوران میں بتایا "شہیدِ رسالت جب کراچی پہنچے تو گھوڑا گاڑی چلانا شروع کی۔ وہاں ہمارے گاؤں کی نصف تعداد ملازمت اور مزدوری وغیرہ کے سلسلے میں رہائش پذیر تھی۔ آپ کے ایک دوست غنی خان نے کہیں سے اخبار میں پڑھا کہ آریہ سماج ہندو نتھورام نے بے ادبیوں اور گستاخیوں پر مشتمل ایک کتاب "تاریخ اسلام" لکھی ہے جس کی وجہ سے اس پر حیدر آباد میں کیس چلتا رہا، اب اس نے کراچی میں اپیل دائر کر رکھی ہے۔ یہ بات سننے پر غازی عبدالقیوم شہیدؒ نے پوچھا کہ سندھ میں اسقدر مسلمان ہیں مگر اس بدزبان کو کسی نے نہیں پوچھا کہ سرورِ کائنات (علیہ السّلام والصّلوٰۃ) کی شان میں گستاخی کرنے کی تجھے کس طرح جراءت ہوئی؟ کیا ہم اسقدر بے غیرت ہو چکے ہیں؟ اس کے بعد آپ نے کہا، میرے پاس چھوٹا چاقو

ہے۔ میں اسے توڑتا ہوں اور اس مردار کے لیے ایک بڑا چاقو خریدوں گا۔ الغرض یہ دونوں دوست بازار گئے، چاقو خرید کرنے پر شہبازِ محبّت نے اپنے رفیق محترم سے کہا کہ میں نے یہ تیز دھار آلہ خاص نتھورام کے لیے حاصل کیا ہے۔ دعا کرو کہ اللہ مجھے اس سے عدالت ہی میں ملوا دے اور میں مردود مذکور اور اس کے کارندوں کو بتا دوں کہ میرے رسول (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی عظمت و تقدیس میں یاوہ گوئی کا فیصلہ انگریز کی عدالت سے نہیں کسی غیرت مند مسلمان کے خنجر کی نوک ہی سے ممکن ہے۔ پھر ایک جمعۃ المبارک کو وہ اپنی گھوڑا گاڑی میں کھڈہ مارکیٹ (کھارادر) کے بالمقابل "میمن مسجد" میں پہنچ گئے۔ ان دنوں یہاں کے مولانا صاحب ایک پکّے مسلمان سچّے عاشقِ رسولؐ اور ہندوؤں کے سخت مخالف تھے۔ پورے شہر میں ان کا فتویٰ معتبر خیال کیا جاتا۔ نماز سے فارغ ہونے کے بعد اس شیر دل مجاہدؒ نے گستاخِ رسول کی سزا پوچھی۔ جب شرعی نقطۂ نظر معلوم ہو گیا تو آپ نے مردودِ رسالت پناہ کو واصلِ جہنّم کر دینے کا پختہ ارادہ فرما لیا اور اس روز سورج کے نمودار ہوتے ہی اپنی شکار گاہ یعنی عدالت کے احاطے میں آ گئے۔ بتایا جاتا ہے کہ عبدالقیومؒ نے جو بعض دوسرے مسلمانوں کے ساتھ نتھورام کے قریب بیٹھا ہوا تھا، چاقو نکالا اور نتھورام کی پلیٹھ میں گھونپ دیا۔ نتھورام چلّایا اور بیان ہے کہ ایک اجنبی شخص آگے بڑھا اور حملہ آور کو پکڑ لیا مگر عصمتِ نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا محافظ شدید غصّے میں تھا۔ اس نے خود کو چھڑا کر اپنا چاقو مردود مذکور کے شکم میں اتار دیا۔ نتھورام بُری طرح زخمی ہو کر زمین پر گر پڑا۔ اس کے جسم سے خون بہہ رہا تھا۔ مضروب کی حالت نازک تھی۔ اس کو سول ہسپتال پہنچایا گیا لیکن علاج معالجے سے قبل ہی وہ فنا فی النّار ہو چکا تھا۔ غازی عبدالقیوم شہیدؒ نے اس بدزبان گستاخِ رسولؐ کو عین دوپہر کے وقت کمرۂ عدالت میں کیفرِ کردار تک پہنچایا اور پولیس کے سامنے برملا فرمایا کہ نتھورام کو میں نے ہی نہایت سوچ سمجھ کر قتل کیا ہے۔ اور پیغمبرِ خدا (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی توہین کرنے والوں کا یہی انجام ہونا چاہیے۔

ایک پیشی پر جج صاحبان نے غازی موصوفؒ سے پوچھا کہ آپ نے نتھورام کو کیوں قتل کیا؟ تو انہوں نے سامنے دیوار پر آویزاں جارج پنجم کی تصویر کی جانب انگلی کا اشارہ

کرتے ہوئے فرمایا۔ "مجھے تم یہ بتاؤ کہ اگر کوئی شخص اس کے متعلق توہین آمیز کلمات
کہے تو عدالت کیا کرے گی؟" جواب ملا کہ ہم اسے قانون کے مطابق سخت سزا دیں گے۔"
اس پر پروانۂ شمعِ رسالتؐ نے نہایت اطمینان سے فرمایا کہ "جب تم ایک دنیاوی بادشاہ
کی گستاخی پر معاف نہیں کر سکتے تو ہم آقائے دوجہاں نبیٔ فخر الزماں (صلی اللہ علیہ وآلہٖ
وسلم) کی ذاتِ بابرکات کے بارے میں بدتمیزی کرنے والوں کو کیونکر برداشت کریں
بلکہ جو سزا میں نے ملعون کو دی ہے، یہ بہت ہی کم ہے۔ اگر میرے بس میں ہوتا تو میں
اسے ہزار بار قتل کرتا اور شاید یہ سزا بھی ہمارے جذبات کو ٹھنڈا نہ کر سکتی۔"

۱۳ر اکتوبر کو حسبِ توقع غازی عبدالقیومؒ کو کراچی کی عدالت سے سزائے موت
کا مستحق قرار دیا گیا۔ آپ نے موت کی سزا نہایت صبر و تحمل اور خندہ پیشانی کے ساتھ سنی
جج اور جیوری کے "منصفانہ" فیصلے پر شکر ادا کیا اور بڑے سکون کے ساتھ کٹہرے سے
"اللہ اکبر" کے نعرے لگاتے باہر نکل آئے۔ ۱۴ر اکتوبر ۱۹۳۴ء کو صبح دس
بجے حضرت غازی علیہ الرحمۃ سے ان کے رشتہ داروں کی ایک ملاقات ہوئی۔ غازی موصوف
بوقتِ ملاقات تلاوتِ قرآنِ حکیم میں محو تھے اور بے حد ہشاش بشاش نظر آتے۔ والدہ محترمہ
نے فرمایا "بیٹا میں خوش ہوں کہ تم نے ناموسِ سرورِ کونین (صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم) پر
اپنے آپ کو قربان کر دیا۔ اگر کچھ خیال ہے تو صرف اتنا کہ اگر تمہارے دل میں یہی جوشِ
قربانی تھا تو تمہاری شادی جس کو قلیل عرصہ ہوا نہ کرتی۔ غازی صاحبؒ فقط ایک لحظہ
خاموش رہ کر فرمانے لگے "ماں، جو لوگ رات کو شادی کرتے ہیں اور صبح مر جاتے ہیں
وہ بھی تو ہیں نا!" والدہ صاحبہ نے خوشی کا اظہار کرتے ہوئے دعا کے لیے کہا۔ حضرت
قبلہ غازی صاحبؒ نے نہایت خضوع و خشوع سے بہ تعمیل حکم سب کے لیے دعا فرمائی۔
آپ نے جملہ لواحقین کو تلقینِ صبر کی اور فرمایا کہ یہ جانِ ناتواں شمعِ رسالتؐ پر جب نثار
ہو جائے اور میں شہید کہہ دیا جاؤں تو آپ نہایت صبر اور حوصلے سے کام لیں۔ اگر
تم میں سے کسی نے ایک آنسو بھی بہایا تو سرورِ ہر عالم (صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم) کی بارگاہ
میں اس سے دامنگیر ہوں گا۔ ازاں بعد طمانیت قلبی سے "السلام علیکم" کہہ کر آپ اپنے

محبوب ترین شغلِ دوامی تلاوتِ کلام اللہ العزیز میں مشغول ہو گئے ــــ اسی رات
جیل میں ایک عجیب و غریب واقعہ ہوا۔ اس کی تفصیلات کئی روز تک اخبارات کا
موضوع بنی رہیں۔ وضاحت کچھ یوں ہے کہ ۱۵ر اکتوبر کی شب سنٹرل جیل کراچی کے
وارڈن نے جو پہرہ دے رہا تھا دیکھا کہ غازی عبدالقیوم خانؒ کی کوٹھڑی کا دروازہ کھلا
ہوا ہے اور کوٹھڑی بقعۂ نور بن گئی ہے۔ دو سفید پوش نورانی چہروں والے بزرگ
غازی صاحبؒ کے پاس بیٹھے ہوئے ان سے ہم کلام ہیں۔ وارڈ یہ دیکھ کر گھبرا اٹھا اور
دوڑ کر چند اور وارڈوں کو بلا لایا۔ انہوں نے بھی اس خرقِ عادت واقعہ کو اپنی آنکھوں
سے دیکھا۔ اس پر خطرے کی گھنٹی بجائی گئی اور بہت سے ملازم جمع ہو گئے لیکن انہوں نے
دروازہ بند پایا۔ کوٹھڑی میں تاریکی ہو چکی تھی اور غازی صاحبؒ بھی تنہا پائے گئے۔

یہ مقدمہ ہندوستان بھر میں بڑی شہرت اختیار کر گیا تھا۔ سید محمد اسلم ایڈووکیٹ جو
مردِ مجاہد کی طرف سے پیروکار تھے، انہوں نے جوڈیشل کمشنر کی عدالت میں یہ درخواست
بھی گزاری کہ عبدالقیومؒ کی جانب سے مندرجہ ذیل گواہ طلب کیے جائیں تاکہ وہ تحریکِ
شاتمِ رسولؐ کا پس منظر، اہلِ ایمان کے عقیدہ اور از روئے شرعِ اسلامی گستاخِ نبیؐ کے
لیے سزا کے بارے میں فاضل جج صاحبان کے روبرو اپنا موقف پیش کر سکیں۔ فہرستِ
اسمائے یہ ہے۔ مولانا ابو الکلام آزاد، رپن سٹریٹ کلکتہ۔ مولانا مفتی کفایت اللہ صدر
جمعیت العلماء ہند، دہلی۔ مولانا احمد سعید ناظم جمعیۃ العلماء ہند، دہلی۔ مولانا ظفر علی خاں
ایڈیٹر روزنامہ زمیندار، لاہور۔ مولوی محمد صادق صاحب کراچی۔ پیر سید غلام مجدد سرہندی
سندھ، مولوی محمد عثمان، سندھ۔ شیخ عبداللہ ایڈیٹر "نو مسلم"، حیدر آباد۔ علامہ ڈاکٹر
محمد اقبال، لاہور۔ ایم فتح علی، سندھ۔ میر آغا حسن جان سرہندی۔ مولانا محمد نعیم لدھیانوی
مولانا سید عطاء اللہ شاہ بخاری، امرتسر۔ مولانا عبدالمجید سالک، ایڈیٹر "انقلاب" لاہور۔
مسٹر سید محمد اسلم ایڈووکیٹ نے عدالت کے استفسار پر مزید بتایا کہ ان مشاہیر کی آرا سے
معلوم ہو گا کہ امتِ مسلمہ کے دل میں پیغمبر علیہ الصلوٰۃ والسلام کا کس درجہ احترام ہے اور
آپ کی عزت و ناموس کے متعلق مسلمانوں کے صحیح جذبات و عقائد کیا ہیں؟ یہ معزز حضرات

یہ بھی بتائیں گے کہ جب پیغمبر خدا (صلی اللہ علیہ وسلم) کی ذات پر حملہ کیا جائے تو فرزندانِ توحید کا خون کس طرح کھول اُٹھتا ہے اور وہ کیونکر انتقام پر اُتر آتے ہیں۔

مناسب معلوم ہوتا ہے کہ عدالت میں غازی عبدالقیوم شہیدؒ کے ایمان افروز بیانات اور اُن کی جرأتِ ایمانی سے متعلق کچھ مزید معلومات بھی سامنے آجائیں تاکہ آپ کے خلوصِ نیت اور جوش وغضب کی صحیح حالت کا پتا چل سکے۔ آپ نے پولیس اور بعدازاں مجسٹریٹ کے روبرو جرأت مندانہ بیان قلمبند کرواتے ہوئے فرمایا تھا "اس شخص (نتھورام) نے میرے پیغمبر (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو گالیاں دی تھیں۔ میرے ہوش وحواس بالکل بجا ہیں۔ میں وثوق سے کہتا ہوں کہ مجھے اقبالِ قتل کے لیے مجبور نہیں کیا گیا اور نہ ہی مجھ پر کوئی دباؤ ہے اور میں یہ بھی جانتا ہوں کہ میں جو کچھ بیان کر رہا ہوں اسے میرے خلاف بطورِ شہادت استعمال کیا جائے گا۔۔۔۔" میری زندگی کا سب سے زیادہ خوشگوار دن وہی تھا۔ ہر وہ شخص جو میرے آقا و مولا (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی شانِ اقدس میں گستاخی کرتا ہے، میرا عقیدہ ہے کہ وہ خدا تعالیٰ کی توہین کرتا ہے اور میں بھی اسی جذبے سے سرشار ہو کر اپنی زندگی شہنشاہِ مدینہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے قدموں پر نچھاور کر رہا ہوں۔ میں نے ایمانی جذبہ کے تحت نتھورام کو موت کے گھاٹ اتارا ہے اور میں پوری دنیا پر واضح کر دینا چاہتا ہوں کہ جب تک ایک بھی سچا مسلمان باقی ہے آقائے کونین (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی ناموس پر حملہ کرنے والا کبھی زندہ نہیں رہ سکتا"۔

۴ر مارچ کو اگرچہ اس بات کا اعلان ہو چکا تھا کہ بمبئی سے آمدہ احکام کے مطابق غازی عبدالقیوم خانؒ جن کی پھانسی کے لیے دوشنبہ کا دن مقرر کیا گیا تھا، آئندہ حکم تک کے لیے ملتوی کر دیا گیا ہے۔ بایں ہمہ سارے شہر کے مسلمانوں نے اپنے کام کاج چھوڑ کر صبح جیل کے نزدیک اجتماع کیا اور نہایت زوردار طریقہ سے اپنے غازی سے ملاقات کا مطالبہ کیا۔ جیل کے چاروں طرف پولیس کا حلقہ تھا۔ ضلع کے تمام افسرانِ اعلےٰ صورتحال کا باقاعدہ معائنہ کر رہے تھے۔ انتظامیہ کی بداندیشی سے اس جمِ غفیر نے اعلیٰ افسران

اور پولیس پر سنگباری کی جس سے متعدد کانسٹیبل اور دو افسر زخمی ہوئے۔ پورے کراچی کی فضا کشیدہ تھی۔ نوجوانانِ ملت دیوانہ وار جیل کی طرف کھنچے آتے اور مسلمان جا بجا ٹولیوں میں غازی صاحب کی تصویر اُٹھائے اپنی عقیدت کا اظہار کر رہے تھے۔ ایسے میں ممکن نہ تھا کہ انگریز حکومت اس جانکاہ مرحلے سے بآسانی نکل سکے ۱۹ر مارچ ۱۹۳۵ء کو غازی موصوفؒ نے جامِ شہادت نوش فرمانا تھا مگر اس فیصلے کی کسی کو خبر نہ دی گئی۔ آدھی رات سے ذرا دیر پہلے آپ کے بعض قریبی رشتہ داروں کو بصیغۂ راز جیل کے اندر لایا گیا کہ وہ میت کو حاصل کر سکیں۔ جانباز و سرفروش مجاہد کے لیے یہ شب شبِ برات سے کم نہ تھی۔ آپ نے صاف ستھرا لباس زیب تن فرمایا اور کوٹھڑی خوشبوؤں سے معطر کی۔ تمام رات نوافل اور تلاوت میں بتا دی۔ آپ کے ہونٹوں پر مسکراہٹ کی چاندنی رقص کناں تھی اور آنکھوں میں جلوۂ حبیبؐ کے روشن چراغ۔ جب مقررہ وقت نزدیک آپہنچا تو آپ بصد شوق مقتل کی جانب روانہ ہوئے۔ اضطراب تھا نہ التہاب۔ پریشانی تو ان کا مقدر رہے جو غزل کے بھنور میں ہیں۔ جن کا قافلہ وادئ نعت کی سمت چلے، وہاں داغِ محرومی کا کیا علاقہ؟ اس جگہ تو گیسوئے رحمت دراز ہوتے ہیں۔ بہشت نظر سے کام چلتا ہے۔ گل پوشیوں سے نکلے تو گل پاشیوں میں گھر گئے۔ اب بزمِ دار و رسن سج رہی تھی۔ مستانۂ حبیبِ کبریا (علیہ الصلوٰۃ والثنا) پھانسی کے پھندے کو چوم کر اپنی آنکھوں سے لگا رہا ہے۔ ایسی موت پر تو کروڑوں زندگیاں قربان ——— تاجدارِ مدینہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا عاشقِ صادق قتل گاہ میں پہنچا بھی تو کس سج دھج سے۔ موت کو ٹھوکر لگاتے، ہنستے مسکراتے، نعت گنگناتے، تبسم کی بجلیاں گراتے، بقا کا چراغ جلاتے اور رگِ جان کی تار ہلاتے ——— غازی عبدالقیوم خانؒ "میں حاضر ہوں یا رسول اللہ (صلی اللہ علیک وسلم)" فرماتے ہوئے تختۂ دار پر جھول گئے۔

علی الصبح یہ خبر بجلی کی طرح پورے کراچی میں دوڑ گئی کہ غازی موصوف کو جامِ شہادت پلا دیا گیا ہے۔ یہ اطلاع ملتے ہی مسلم تجارتی حلقوں میں تمام کاروبار بند ہو گیا اور کم و بیش ایک لاکھ مسلمان ڈسٹرکٹ جیل کی طرف چل پڑے۔ عاشقانِ رسولؐ کا یہ ٹھاٹھیں مارتا ہوا

سمندر مشتعل تھا کہ ہمیں پھانسی دینے کی اطلاع پہلے کیوں نہیں ملی۔ حکام نے شہیدِ ناز کی نعش کو میوا شاہ قبرستان میں پہنچا دیا جہاں مسلمانوں نے بہ تعدادِ کثیر نمازِ جنازہ ادا کی۔ اُس دن ایک جانگداز اور لرزہ خیز حادثہ ہوا۔ لاکھوں کے ہجوم پر گورا پلٹن نے گولیوں کی بارش برسائی اور تین سو سے کہیں زیادہ کلمہ گو جاں بحق اور ہزاروں کی تعداد میں شدید زخمی ہو گئے۔

غازی عبدالقیوم شہیدؒ کی آخری آرام گاہ میوا شاہ قبرستان (چاکیواڑہ) کراچی میں ہے۔ سن رسیدہ ان گنت افراد آپ کی عقیدت و احترام کا دم بھرتے ہیں۔ مگر نئی نسل اپنے اس عظیم مجاہد کے جوش و ولولہ سے ناواقف ٹھہری۔ آہ، وہ قوم جو اپنے محسنوں کے افکار و کردار کو بھلا بیٹھے! ___ غازی عبدالقیوم شہید جو عشقِ رسول (صلی اللہ علیہ و آلہٖ وسلم) کا بھڑکتا ہوا شعلہ تھا، جس کی رگوں میں غیرتِ ایمان کی بجلیاں دوڑتی تھیں۔ جنہیں مدینہ طیبہ سے پیام و سلام آتے تھے۔ وہ گلشنِ وصل کا ایک مہکتا ہوا گلاب ___ رفعتِ دار کا امین اور سوز و سازِ محبت کا سوداگر تھا جس کی خاکِ قدم سے عظمت نے اپنے ماتھے پر تلک کھینچا اور مقامِ شہادت کے لیے بھی باعثِ ناز ہے۔

حکیم الاُمّت حضرت علامہ محمد اقبالؒ شہید موصوفؒ کے جذبۂ شہادت سے متاثر تھے کہ انہوں نے "ضربِ کلیم" میں "لاہور و کراچی" کے عنوان سے آپ اور غازی علم الدین شہیدؒ کو شاندار الفاظ میں خراجِ تحسین پیش کیا ہے۔ لکھتے ہیں۔

نظر اللہ پہ رکھتا ہے مسلمانِ غیوّر
موت کیا شے ہے؟ فقط عالمِ معنیٰ کا سفر
ان شہیدوں کی دِیَت اہلِ کلیسا سے نہ مانگ
قدر و قیمت میں ہے خوں جن کا حرم سے بڑھ کر
آہ اے مردِ مسلماں تجھے کیا یاد نہیں
حرفِ "لَا تَدْعُ مَعَ اللّٰہِ اِلٰھًا آخَر"

ہری پُور کے سرفروش مجاہد

غازی عبدالقیوم شہید رحمۃ اللہ تعالیٰ

تحریر: اشرف عطا

شدھی اور سنگٹھن کی تحریک جس کا آغاز آریہ سماجیوں نے مسلمانوں کو شدھی کرنے کے سلسلہ میں کیا تھا، رفتہ رفتہ پورے ہندوستان میں پھیل گئی۔ یہ تحریک کئی حصوں میں بٹی ہوئی تھی۔

۱۔ مسلمانوں کے خلاف اُن شہروں میں فسادات کی آگ بھڑکانا، جن میں ہندوؤں کی اکثریت ہے اور وہ منظم ہیں۔

۲۔ ہندو محلوں میں غنڈوں، بدمعاشوں اور پہلوانوں کی ایسی تنظیمیں قائم کرنا جو مسلمانوں کا مقابلہ کر سکیں۔ ان غنڈوں، بدمعاشوں اور پہلوانوں کو آریہ سماج اور محلہ کے ہندو اور سبھا کی طرف سے نہ صرف مالی امداد دی جاتی تھی بلکہ ان کے لیے ہر قسم کا سامان تعیش بھی مہیا کیا جاتا تھا۔

۳۔ آریہ سماج اور ہندو مہا سبھا کی زیر نگرانی ہندو نوجوانوں کی ایک نیم فوجی تنظیم قائم کی گئی جس کا نام مہابیر دل تھا۔ جو بعد میں راشٹریہ سیوک سنگھ کی صورت اختیار کر گئی۔ اس جماعت کے سپرد یہ کام تھا کہ وہ فسادات کے دنوں میں نہ صرف ہندو آبادی کی حفاظت کرے بلکہ مسلمانوں کے محلوں پر منظم حملے بھی کرے۔

۴۔ ہندو سبھا کے زیر اہتمام ایک اور تنظیم، قائم کی گئی جسے سیوا سمتی کا نام دیا گیا۔ بظاہر یہ تنظیم "خدمتِ خلق" کے موٹو کے تحت قائم کی گئی تھی لیکن حقیقتاً اس کے مقاصد میں یہ شامل تھا کہ وہ بھولے بھٹکے اور لاوارث مسلمان بچیوں اور بچوں کو اغوا کر کے مختلف شہروں میں رکھ کر انہیں ہندو بنا لیتے۔

۵۔ آریہ سماج اور ہندو مہاسبھا کے زیرِ اہتمام ایک شعبہ ایسا قائم کیا گیا جس کے ذمے یہ کام تھا کہ وہ اسلام اور بانیٔ اسلام حضرت محمد مصطفےٰ احمد مجتبےٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ اقدس و اطہر سے متعلق ایسی کتابیں شائع کرے جو انتہائی دل آزار اور توہین آمیز ہوں۔

جہاں تک ہندو مہاسبھا اور آریہ سماج کی پہلی چار تنظیموں کا تعلق تھا مسلمان اُن سے قطعاً خائف نہیں تھے، وہ پورے ملک میں ہندوؤں کے حملے کی مدافعت کرنے کی طاقت رکھتے تھے، اس سلسلہ میں شدھی کی تحریک کا مقابلہ کرنے کے لیے امرت سر میں تنظیم قائم کی گئی۔ اور تبلیغ کا کام جمعیۃ العلمائے ہند نے سنبھال لیا۔ اس سلسلہ میں دیوبندی، بریلوی اور اہلِ حدیث علماء نے بڑا اہم رول ادا کیا۔ لیکن ہندو مہاسبھا اور آریہ سماج کے شعبہ نشر و اشاعت نے بعض ایسی کتابیں آریہ سماجی ناشروں کے ذریعہ شائع کرائیں جو انتہائی دل آزار تھیں۔ ان کتابوں کی اشاعت سے مسلمانانِ ہندوستان مشتعل ہو گئے۔ اور وہ مشتعل ہونے میں حق بجانب تھے، کیونکہ ہر مسلمان کا ایمان ہے کہ وہ اپنی اولاد، اپنے مال و منال اور اپنی جان عزیز سے بھی آنحضرت صلعم کی عزت و احترام کو مقدم سمجھتے ہیں۔ مسلمان ہر قسم کے مصائب و آلام جبر و تشدد، بربادی، ویرانی اور تباہی کو برداشت کر سکتا ہے۔ اور وہ دیکھ سکتا ہے کہ اس کی اولاد کو اس کے سامنے ذبح کر دیا جائے، اس کی جائیداد کو برباد کر دیا جائے، اس کے مکان کو نذرِ آتش کر دیا جائے۔ اس کی بستی کو تباہ کر دیا جائے، لیکن وہ اسے کبھی برداشت نہیں کر سکتا کہ کوئی بد دہن اس کے آقا و مولا (صلعم) کی شان میں گستاخی کرے۔ چنانچہ جب ہندو مہاسبھا اور آریہ سماج نے بزرگانِ اسلام پر تحریری حملوں کا سلسلہ شروع کیا، تو مسلمان نوجوان اسے برداشت نہ کر سکے۔ اور انہوں نے اس غلاظت کو روکنے کے لیے جان کی بازی لگا دی۔

دہلی میں عبد الرشید غازی نے سوامی شردھانند کو ٹھکانے لگایا، کلکتہ میں بھولا ناتھ کا لاہور کے ایک نوجوان عبداللہ نے صفایا کرنے کی کوشش کی،

وہ تو بچ گیا، لیکن اُس کا ملازم ہلاک ہو گیا۔ خدا بخش (۰۰۰؟) اور علم الدین غازی نے شاتمِ رسول (صلعم) راجپال کو کیفرِ کردار تک پہنچانے کی کوشش کی، خدا بخش (۰۰۰؟) تو کامیاب نہ ہو سکا، وہ گرفتار ہوا، اور اُسے سات سال کے لیے جیل پہنچا دیا گیا۔ لیکن علم الدین غازی نے راجپال کا صفایا کر دیا۔ امرت سر میں (ورتمان) کے خلاف مظاہرے ہوتے۔ کراچی میں ایک سرحدی نوجوان عبد القیوم نے نتھو رام شاتمِ رسول پر حملہ کیا اور اُسے ٹھنڈا کر دیا،

عبد القیوم کو گرفتار کر لیا گیا اور اسے پھانسی کی سزا دی گئی۔ اس کے جنازہ کے سلسلہ میں کراچی میں فرقہ وارانہ فساد شروع ہو گیا۔ اور کراچی کے کوچہ و بازار خون سے گلرنگ بن گئے۔ ہندوؤں نے اس فساد کی پہلے سے تیاری کر رکھی تھی۔ چنانچہ عبد القیوم شہید کے جنازہ کا جلوس جب عیدگاہ کی طرف مڑا تو ہندوؤں کی طرف سے خشت باری کا سلسلہ شروع ہو گیا اور اس طرح کراچی کی پُرامن فضا دیکھتے آنکھوں جہنم زار بن گئی۔ فسادات کی آگ ہر طرف پھیل گئی۔ قتل و خوں ریزی کا بازار گرم ہو گیا۔ آخر کار حالات پر قابو پانے کے لیے فوج طلب کر لی گئی۔ گورا فوج کے دستوں نے عیدگاہ کی طرف جانے والی ہر اس سڑک پر اندھا دھند فائرنگ کی۔ جس پر اسے کوئی مسلمان نظر آیا۔

کراچی کی پوری تاریخ میں ایسا ہولناک فساد آج تک نہیں ہوا تھا۔ شہر میں کرفیو لگنے کے باوجود گولیاں چلنے کی آوازیں آتی رہیں۔ دکانوں اور گوداموں کے تالے توڑے جا رہے تھے، مسلمان بستیوں پر فوج کی مدد سے منظم حملے کیے جا رہے تھے۔ اکثر بازاروں سے آگ کے شعلے آسمان سے باتیں کرتے نظر آ رہے تھے۔ کراچی کا یہ فساد آریہ سماج اور ہندو مہاسبھا کی مشترکہ کوششوں اور منظم سازش کا نتیجہ تھا۔ سندھ کے لیڈروں میں سے سر عبداللہ ہارون اور سر غلام حسین ہدایت اللہ نے اپنے اپنے بیانات میں ان فسادات کی مذمت کی اور حکومت سے مطالبہ کیا کہ

مسلمانوں کے نقصان کی تلافی کی جائے اور بغاوت کی آزادانہ تحقیقات کرائی جائے۔

ادھر کراچی میں انسانی خون سے ہولی کھیلی جا رہی تھی۔ اُدھر پنجاب میں ہندو پریس نے ہنگامہ آرائی اور اشتعال انگیزی کا سلسلہ جاری کر رکھا تھا۔ "پرتاپ" اور "ملاپ" جو صحافت کے میدان میں ایک دوسرے کے زبردست حریف تھے، اپنی اشتعال انگیز تحریروں اور نظموں سے جلتی پر تیل چھڑک رہے تھے۔ "ملاپ" میں لالہ گوری شنکر اور مہاشہ خوشحال چند خورسند اور "پرتاپ" میں مہاشہ کرشن اور لالہ نانک چند ناز نظم اور نثر کے میدان میں فرقہ پرستی کی آگ کو ہوا دینے کے سلسلے میں ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کی کوشش کر رہے تھے۔ شاتمِ رسول نتھو رام کی تعریف میں نظمیں اور مقالے شائع کیے جا رہے تھے۔ اور اس طرح مسلمانوں کے زخموں پر نمک چھڑکنے کی کوشش کی جا رہی تھی۔ "پرتاپ" اور "ملاپ" کی ہرزہ سرائی اور اشتعال انگیزی حدِ اعتدال سے تجاوز کر چکی تھی۔ لیکن حکومتِ پنجاب مسلمانوں کے احتجاج کے باوجود خاموش تھی۔ اسلامی پریس نے جس میں "زمیندار"، "انقلاب" اور "احسان" شامل تھا۔ جب پانی سر سے گزرتا دیکھا۔ اور یہ محسوس کیا کہ لاتوں کے بھوت باتوں سے نہیں مانیں گے تو "احسان" میں آغا تے احمد خاں بیکش، مولانا چراغ حسن حسرت اور اقم الحروف نے نانک چند ناز کی نظموں کا، جو نتھو رام کی تعریف و ثنا میں شائع ہو رہی تھیں، نوٹس لیا اور نثر اور نظم کے میدان میں جب "پرتاپ" اور "ملاپ"، کو ترکی بہ ترکی جواب ملنا شروع ہوا تو وہ بلبلا اٹھے۔ اور حکومتِ پنجاب پر زور دیا جانے لگا کہ "احسان" فرقہ وارانہ زہر پھیلا رہا ہے اور مسلمانوں کو فساد پر اُبھار رہا ہے۔ اس لیے اس کے خلاف پریس ایکٹ کے تحت مقدمہ چلایا جائے۔ اور کارروائی عمل میں لائی جائے۔ "احسان"، کو منصۂ شہود پر آتے ابھی تھوڑا ہی عرصہ ہوا تھا کہ حکومتِ پنجاب نے حسبِ ذیل نظم کی بناء پر "احسان" سے دو ہزار روپے کی ضمانت جمع کرائی گئی تھی وہ ضبط کرالی گئی۔ اس نظم کا عنوان تھا۔ "شاتمِ رسول صلے اللہ علیہ وسلم نتھو رام کا انجام"

جذبۂ مسلم کی پیدا ہو نہیں سکتی مثال ۔۔۔ عشق اس کا غیر فانی اُلفت اس کی لازوال

سر بکف رہتا ہے وہ ناموسِ ملت کے لیے ۔۔۔ برق ہے باطل کے خرمن کیلئے اس کا جلال

اس کی غیرت کا سمندر موجزن جب بھی ہوا ۔۔۔ بہہ گئے خاشاک کی مانند اس میں بد سگال

اس کی ہیبت سے سیہ کار تھرّاتے رہے

اس کی سطوت نے کیا اعدائے حق کو پائمال

"احسان" کے مالک نور الٰہی نے یہ ضمانت فوری طور پر جمع کرا دی۔ اور "پرتاپ" اور "ملاپ" کی اشتعال انگیزی کا ترکی بہ ترکی جواب دیتا رہا۔ عبد القیوم سرحد کا رہنے والا نوجوان تھا۔ بھاری بھر کم دوہرا جسم۔ بڑی بڑی آنکھیں۔ گورا چٹا رنگ۔ کشادہ پیشانی جس سے جلال ٹپکتا تھا۔ مضبوط قویٰ۔ گھنی سیاہ داڑھی۔ پابندِ صوم و صلوٰۃ۔ مذہب کا شیدائی اور نبی آخر زماں کا فدائی۔ وہ سرحد سے ایسے عزائم لے کر کراچی پہنچا تھا کہ شاتمِ رسولؐ نتھو رام کو ٹھکانے لگائے جب وہ اپنے اس عزم میں کامیاب رہا تو اس نے پولیس اور عدالت کے روبرو بڑی جرأت سے اس امر کا اعلان کیا۔

جب تک ایک بھی کلمہ گو مسلمان موجود ہے اور اس کے سینہ میں ایمان افروز دل موجود ہے وہ یہ برداشت نہیں کر سکتا کہ کوئی بد دہن اس کے آقا و مولاؐ کی شان میں گستاخی کرے اور اس کی نظروں کے سامنے زندہ رہے، میں اعلان کرتا ہوں کہ میں نے نتھو رام کو قتل کیا ہے اور وہ جہنم کا ایندھن بن چکا ہے۔ اگر مجھے رہا کر دیا جائے تو میں رہا ہونے کے بعد بھی ہر اس شخص کے خلاف جو میرے آقا و مولاؐ کی شان میں گستاخی کرے گا، یہی کارروائی عمل میں لاؤں گا جس کا مظاہرہ میں نے نتھو رام کو جہنم واصل کرنے کے سلسلہ میں کیا ہے۔

عبد القیوم کے اس جرأت مندانہ بیان کا حوالہ بمبئی لیجسلیٹو کونسل میں اس وقت دیا گیا جب کہ کونسل میں فسادات کراچی کے سلسلہ میں بحث ہو رہی تھی اور سر غلام حسین ہدایت اللہ

کی طرف سے اس امر کا مطالبہ کیا جا رہا تھا کہ کراچی فائرنگ کی آزادانہ تحقیقات کرائی جائے اور مسلمانوں کے نقصان کی تلافی کی جائے، بمبئی کونسل کے مسلمان ارکان کی طرف سے بھی یہ مطالبہ کیا گیا کہ بانیان مذاہب کے تحفظ کا قانون نافذ کیا جائے اور بددہن افراد کو قرار واقعی سزا دی جائے۔ اگر حکومت نے ایسا نہ کیا تو اپنے آقا و مولا کی عزت و احترام کو برقرار رکھنے کے لیے اس برصغیر میں سینکڑوں نہیں ہزاروں عبدالقیوم پیدا ہوں گے جب تک ہندو مہاسبھا اور آریہ سماج کی سرگرمیوں پر قدغن اور پابندی عائد نہیں کی جاتی۔ فسادات کا سلسلہ جاری رہے گا۔ اور ملک ترقی اور سکون دونوں سے محروم ہو جائے گا۔ مسلمانوں کو یہ درس دیا گیا اور تلقین کی گئی ہے کہ وہ کسی کے بتوں کو بھی برا نہ کہیں مبادا کوئی خاکم بدہن ان کے آقا و مولا کی شان میں گستاخی کرنے کی جرأت کر بیٹھے اس ہدایت کے بعد کوئی مسلمان کسی دوسرے مذہب والے کی دل آزاری نہیں کرتا اور دوسرے مذاہب کے بزرگوں کی تذلیل اور توہین کا مرتکب نہیں ہو سکتا۔ لیکن مسلمان یہ بھی برداشت نہیں کر سکتا کہ کوئی بددہن ان کی اس خاموشی کو بزدلی پر محمول کرکے ان کے بزرگوں کی توہین کا مرتکب ہو۔ اگر حکومت نے ایسے شرارتی عناصر کے خلاف قانون کو حرکت دی نہ تو اس کا نتیجہ لازمی طور پر ملک گیر فسادات ہوں گے۔

ایک مسلمان رکن کونسل نے کہا کہ مسلمانوں کو دھمکی دی جاتی ہے، کہ ان کے لئے ہر ہندو سیوا جی مرہٹہ بن جائے گا۔ لیکن ایسا کہنے والوں کو یہ نہیں بھولنا چاہیئے کہ ابھی مسلمانوں میں اورنگ زیب موجود ہیں۔ جو کسی پہاڑی ڈاکو کو ناک چنے چبوانے کی جرأت و جسارت رکھتے ہیں۔

اس تقریر پر بمبئی کونسل میں کافی ہنگامہ ہوا۔ لیکن مسلمان ممبر اپنے موقف پر مضبوطی سے قائم رہے اور انہوں نے واشگاف الفاظ میں اس امر کا اعلان کر دیا۔ کہ مسلمان اس ملک میں ذلت کی زندگی پر موت کو ترجیح دیں گے۔ لیکن اپنے مذہب۔ اپنے پیغمبر اور اپنی مذہبی کتب کی توہین نہیں ہونے دیں گے۔ اسی ہنگامہ آرائی میں کونسل کا جلسہ ملتوی کر دیا گیا۔ لیکن عبدالقیوم کی قربانی کے بعد ایک عرصہ تک کسی آریہ سماجی اور ہندو مہاسبھائی کو راجپال، بھولا ناتھ اور نتھو رام بننے کی جرأت نہ ہوئی۔

پیکرِ غیرت و حمیت

غازی عبدالقیوم شہید نور اللہ مرقدہ

تحریر: سید آلِ احمد رضوی (اسلام آباد)

غازی علم دین شہید کی طرح ناموس رسالت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر قربان ہونے والوں میں سرزمین ہزارہ کا ایک فرزند غازی عبدالقیوم بھی تھا۔ مذہب سے لگاؤ اس کی گھٹی میں پڑا تھا عشقِ مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اس کی رگ و پے میں رچا ہوا تھا۔

ہر کہ عشقِ مصطفےٰ سامانِ اوست

بحر و بر در گوشۂ دامانِ اوست

غازی عبدالقیوم ۱۹۱۲ء میں غازی ہزارہ کے ایک پٹھان گھرانے میں پیدا ہوئے ان کے والد کا نام عبداللہ خان تھا۔ والدین نہایت غریب تھے چنانچہ تعلیم حاصل نہ کر سکے۔ ہوش سنبھالا تو محنت مزدوری شروع کی بھر والد کے سایہ سے بھی محروم ہو گئے۔ ۱۹۳۲ء میں معاش کی تلاش میں کراچی پہنچے۔ غازی کے چچا رحمت اللہ خان کراچی میں تانگہ بانی کرتے تھے انہوں نے بھی یہی پیشہ اختیار کیا اپنی بوڑھی والدہ، بیوہ بہن اور نئی نویلی دلہن کو بھی ساتھ لے گئے اس لئے کہ وہ ان کی آرزوؤں اور تمناؤں کا امین بھی تھا اور ان کی روزی کا واحد سہارا بھی۔

غازی عبدالقیوم محنت مزدوری سے فارغ ہوتے تو گھر کے قریب مسجد میں نماز ادا کرتے۔ ذکر و فکر کی محافل میں شریک ہوتے۔ یہ اوائل ۱۹۳۳ء کا ذکر ہے۔ آریہ سماج حیدرآباد سندھ کے سیکرٹری نتھو رام نے "تاریخ اسلام" کے نام سے ایک کتاب شائع کی جس میں سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی شانِ اقدس میں سخت دیدہ دہنی کا مظاہرہ کیا۔ مسلمانوں میں سخت اضطراب پیدا ہوا۔ انہوں نے شدید احتجاج کیا، جلسے کئے، جلوس نکالے۔ مولانا عبدالمجید سندھی اور دوسرے مسلم لیڈروں نے نتھو رام کے خلاف حیدرآباد میں استغاثہ دائر

کیا۔ نتھورام پر مقدمہ چلا۔ حکومت نے کتاب کو ضبط کر لیا اور ملزم کو معمولی جرمانہ کیا تھا ایک سال
قید کی سزا سنائی گئی۔ اس نے جوڈیشنل کمشنر کی عدالت میں اس سزا کے خلاف اپیل دائر
کر دی۔ عدالت سے اُس کی ضمانت بھی منظور ہو گئی۔ مسلمانوں کو بہت صدمہ ہوا۔ اس وقت
مسلمانوں کے جو جذبات مشتعل تھے۔ وہ کسی سے پوشیدہ نہیں۔ غازی عبدالقیوم نے نتھورام
کی خرافات کا ذکر سنا تو اُس کی غیرت ایمانی بھڑک اُٹھی اُس نے عہد کیا کہ وہ اس شاتم رسول ﷺ
کو جہنم رسید کر کے رہے گا۔ جب تک وہ خبیث زندہ ہے میرا جینا حرام ہے۔

بقول بیرسٹر سید محمد اسلم:

مارچ ۱۹۳۴ء میں نتھورام کی اپیل کی سماعت شروع ہوئی ہندو اور مسلمان بھاری
تعداد میں کارروائی سننے آئے، جن میں، میں بھی شامل تھا۔ نتھورام اپنے ساتھیوں کے ہمراہ
خوش گپیاں کرتا ہوا آیا اور عدالت میں ڈائس کے قریب پڑے ہوئے بنچ پر بیٹھ گیا۔ تھوڑی
سی دیر گزری تھی کہ ایک مسلم نوجوان عدالت کے کمرے میں داخل ہوا۔ معذرت کرتے ہوئے نتھورام
کو تھوڑا سا سرکایا اور پھر اُس کے قریب بیٹھ گیا۔ پونے بارہ بجے کا عمل تھا۔ پندرہ منٹ بعد
نتھورام کی اپیل کی سماعت شروع ہونے والی تھی۔ میں پہنچا تو بارہ بجنے میں چھ سات منٹ
باقی تھے۔ عدالت کے برآمدے میں ایک دوست سے باتیں کرنے لگا۔ اچانک عدالت
کے کمرے سے تیز تیز آوازیں آنے لگیں جیسے کوئی نعرے لگا رہا ہو ساتھ ہی بہت سے آدمی باہر کو
بھاگے میں لپک کر کمرے میں داخل ہوا تو دیکھا! نتھورام کی آنتیں نکلی پڑی ہیں اور وہ زمین
پر پڑا موت و حیات کی کشمکش میں مبتلا ہے۔ اُس کی گدی سے خون کا فوارہ اُبل رہا ہے۔
قریب ہی ایک مسلمان نوجوان ہاتھ میں ایک بڑا سا خون آلود خنجر لیے کھڑا نظر آ رہا ہے۔ دو انگریز ججوں
میں سے ایک جس کا نام اوسالیوان (O. SULLIVAN) تھا۔ ڈائس سے اترا، مسلم نوجوان پر
قہر آلود نگاہ ڈالی اور تحکمانہ انداز میں بولا۔ تو نے اس کو مار ڈالا! ہاں! اور کیا کرتا؟ نوجوان
نے بڑی بے باکی سے جواب دیا۔ اور پھر کمرے میں آویزاں جارج پنجم کی تصویر کی طرف اشارہ

کرتے ہوئے کہا! اگر یہ تمہارے اس بادشاہ کو گالیاں دیتا تو تم کیا کرتے! تم میں غیرت
ہوتی تو کیا تم قتل نہ کر ڈالتے! پھر انتہائی حقارت سے نتھورام کی لاش کی طرف انگلی اٹھائی اور
کہا۔ اس خنزیر کے بچے نے میرے آقا اور شہنشاہوں کے شہنشاہ کی شان میں گستاخی کی
تھی اور اس کی یہی سزا ہے پھر بڑے اطمینان کے ساتھ اپنی نشست پر بیٹھ گیا۔ اتنے میں
پولیس آئی اور غازی کو گرفتار کر لیا۔ اس منظر کو دیکھ کر باغ باغ ہو گیا۔ غازی نے اپنا فرض
ادا کر دیا۔ میں نے اپنا فرض ادا کرنے کا فیصلہ کیا، اور میں نے غازی کے چچا کو تلاش کیا اور
انہیں پیشکش کی کہ میں اس مقدمے کی پیروی مفت کروں گا۔ انہوں نے تشکر آمیز کلمات
کے ساتھ میری پیشکش قبول کر لی۔ دوسرے روز میں غازی کے قانونی مشیر کی حیثیت سے اُن
سے ملاقات کرنے جیل گیا۔ اس سے پہلے میں نے جیل میں قتل کے ملزموں سے مقابلے کی
ملاقاتیں کی تھیں اور ان کی صورتیں مجھے یاد ہیں مگر جو اطمینان اور سکون غازی عبدالقیوم کے چہرے
سے ہویدا تھا وہ کسی اور چہرے پر نظر نہ آیا جب میں نے بتایا کہ میں آپ کا مقدمہ لڑوں گا تو وہ
مرد مجاہد پکار اٹھا۔

"آپ جو چاہیں کریں مگر مجھ سے انکارِ قتل نہ کرائیں اس سے میرے جذبہ
جہاد کو ٹھیس پہنچے گی۔"

میں نے نوجوان غازی کو تسلی دی اور کہا، بیشک آپ اقرار کریں اور میں اس اقبال
کے ذریعے ان شاءاللہ آپ کو پھانسی سے اتار لوں گا۔ مگر میری اس تسلی پر انہوں نے خوشی
کا اظہار نہ کیا میں نے دو چار باتیں اور کیں اور کاغذ پر دستخط کرا کے لوٹ آیا۔ ہندو پیروکاری
کی بوالعجبی ملاحظہ ہو کہ اینگلو انڈین قانون کا ضابطہ اپنی مخصوص اور روایتی چال کی بجائے اتنی
تیزی سے حرکت میں آیا کہ مہینوں کا کام گھنٹوں میں طے ہونے لگا۔ پہلی رپورٹ کے بعد تفتیش
چالان وغیرہ سب کچھ دو دن میں ہو گیا اور مقدمہ قتل عمد سماعت کے لئے ابتدائی عدالت میں
بھیج گیا۔ قتل کے عام مقدموں کے برعکس اس مقدمے کا کام بہت مختصر اور سیدھا سادھا

تھا۔ منفائی کا تو گواہ تھا ہی نہیں۔ سارا دارومدار قانونی بحث پر تھا۔ ثبوت میں اول تو خود عدالت عالیہ کے دو انگریز جج تھے دوسرے غازی نے اقبال جرم بھی کر لیا تھا

غازی عبدالقیوم کے رشتہ داروں اور دوستوں نے اقبال جرم سے روکا مگر اس نے انکار کر دیا آخر عدالت نے غازی کو سزائے موت کا حکم سنایا۔ یہ حکم سنا تو غازی کے منہ سے بے ساختہ نکلا! "الحمدللہ" اور بڑے جوش سے جج کو مخاطب کرتے ہوئے بولا!

"میں آپ کا شکریہ ادا کرتا ہوں کہ مجھے موت کی سزا ملی۔ یہ ایک جان کیا چیز ہے میرے پاس لاکھ جانیں ہوتیں تو وہ بھی ناموس رسالت پر نچھاور کر دیتا۔"

؎ دار را معراج مے دانند سرداران عشق

غازی عبدالقیوم فیصلہ سن کر جیل چلے گئے مسلمانوں نے ان کی جان بچانے کی کوشش کی اس سلسلے میں مسلمانوں کا ایک وفد علامہ اقبال کی خدمت میں لاہور پہنچا اور ان سے درخواست کی کہ غازی کی سزائے موت کو عمر قید میں تبدیل کرنے میں وائسرائے سے ملاقات کریں اور اپنے رسوخ کو کام میں لائیں وفد کی بات سن کر علامہ نے چند ثانیے سوچا۔ پھر بولے!

کیا عبدالقیوم کمزور پڑ گیا ہے؟ اراکین وفد نے کہا نہیں اس نے تو ہر موقع پر اپنے کئے پر خوشی کا اظہار کیا ہے وہ کھلے بندوں کہتا ہے کہ میں نے شہادت خریدی ہے۔ مجھے پھانسی سے بچانے کی کوشش مت کرو۔

علامہ اقبال نے وفد کی یہ بات سنی تو کہا جب وہ کہہ رہا ہے کہ اس نے شہادت خریدی ہے تو میں اس کے اجر و ثواب کی راہ میں کس طرح حائل ہو سکتا ہوں۔ کیا تم چاہتے ہو کہ میں ایسے شخص کیلئے وائسرائے کی خوشامد کروں جو زندہ رہا تو غازی اور مر گیا تو شہید ہے۔ کہتے ہیں کہ علامہ اقبال نے غازی علم الدین شہید اور غازی عبدالقیوم شہید کے واقعات سے متاثر ہو کر یہ شعر کہے۔

؎ نظر اللہ پہ رکھتا ہے مسلمان غیور
موت کیا شے ہے فقط عالم معنیٰ کا سفر
ان شہیدوں کی دیت اہل کلیسا سے نہ مانگ
قدر و قیمت میں ہے خوں جن کا حرم سے بڑھ کر
آہ! اے مرد مسلماں تجھے کیا یاد نہیں
حرفِ لَاتَدْعُ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا آخَرْ

بیرسٹر سید محمد اسلم شاہ صاحب کے مطابق! ایک طرف یہ وفد علامہ کے پاس گیا تو دوسری طرف گورنر بمبئی کے نام رحم کی عرضداشت بھیج دی گئی۔

گورنر کی جانب سے جواب ملا۔ درخواست زیر غور ہے دو ہفتے تک آپ کو نتیجے سے مطلع کر دیا جائیگا۔ گورنر کا جواب ملے تیسرا روز تھا۔ صبح کے وقت میں نے اپنے دفتر میں سنا کہ عبدالقیوم کو پھانسی دے دی گئی۔ میں مولانا عبدالعزیز کو لے کر جیل پہنچا تو وہاں معلوم ہوا کہ صبح اذان کے وقت غازی کے لواحقین کو ان کی جائے قیام پر جگا کر بتایا گیا کہ عبدالقیوم کو پھانسی دے دی گئی ہے۔ لاش کو پولیس سرکاری گاڑی میں رکھ کر میوہ شاہ قبرستان میں لے گئی ہے۔ ہم لوگ جیل سے قبرستان پہنچے تو معلوم ہوا کہ میت قبر میں اتاری جا چکی تھی اتنے میں مسلمانوں کا جم غفیر وہاں پہنچ گیا اور اس نے مٹی ڈالنے نہ دی تھی ایک جوشیلا کارکن قلندر خان قبر میں کود گیا میت کو لحد سے نکالا۔ چارپائی، کفن وغیرہ کا بندوبست پہلے سے ہو چکا تھا۔ فوراً لاش کو کفنایا اور جنازہ لیکر روانہ ہو گئے۔ یہ خبر آگ کی طرح پورے شہر میں پھیل گئی۔ کراچی مسلم اکثریت کا شہر تھا اور صبح کا وقت تھا۔ دیکھتے ہی دیکھتے دفعہ ۱۴۴ کے نفاذ کے باوجود دس ہزار مسلمان جمع ہو گئے۔ ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ نے فوراً فوج طلب کر لی۔ ہم اس عرصہ میں راستہ کاٹ کر چاکیواڑہ کے قریب ایک تنگ گلی سے گزر کر جنازہ کے قریب پہنچ گئے۔ بے پناہ ہجوم تھا۔ کندھا دینے والوں میں قلندر خان

خاصا نمایاں نظر آرہا تھا۔ اچانک ہجوم کا ریلا آیا اور پھر برابر والی تپلی گلی سے "تڑ تڑ" کی آواز گونجی۔ نظر اٹھا کر آگے کا جائزہ لیا تو قلندر خان کے بدن سے خون کا فوارہ اچھلتے دیکھا۔ اس کے باوجود وہ لڑکھڑاتے قدموں کے ساتھ جنازے کو کندھا دیئے جا رہا تھا۔ چند منٹ بعد وہ زخموں سے نڈھال ہو کر گر پڑا۔ اتنے میں پھر گولیوں کی بوچھاڑ آئی۔ ہم بھاگ کر موڑ تک آئے اور موٹر میں بیٹھ کر راہِ فرار اختیار کی۔ نہتے اور پُرامن جلوس پر گوروں نے بے تحاشا فائرنگ کی۔ سینکڑوں مسلمان شہید ہوئے اور ہزاروں مجروح۔

غازی عبدالقیوم کے جنازہ میں ہزاروں افراد نے شرکت کی انہیں بڑی عزت و تکریم کے ساتھ "میوہ شاہ" کے قبرستان میں دفن کیا گیا۔ شمعِ رسالت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پروانے کی ایمان پرور داستان تاریخ عالم میں ہمیشہ کیلئے ثبت ہو گئی۔ کراچی کے ایک شاعر نے غازی کی شہادت پر اپنے جذبات کا اظہار ان اشعار میں کیا ہے۔

؎ مرحبا صد مرحبا قیوم تم   شان سے جاتے ہو بزمِ یار میں
ہم غریبوں کا بھی پہنچانا سلام   سرورِ کونین صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سرکار میں

غازی عبدالقیومؒ کے جنازے میں شریک سوگوار مسلمانوں میں فائرنگ پر فائرنگ

تحریر: راجا رشید محمود

یکم مارچ ۱۹۳۵ء کے اخبارات میں یہ اعلان شائع ہوا کہ غازی عبدالقیوم کو دو شنبہ کے دن ۴ مارچ کو کراچی جیل میں پھانسی دے دی جائے گی۔ یکم مارچ کو انجمن مسلمانان پنجاب کا اجلاس ہوا جس میں شیخ عبدالمجید کی رہنمائی میں آٹھ ارکان پر مشتمل ایک وفد مرتب کیا گیا جن میں حاجی فضل الٰہی آنریری مجسٹریٹ، عبدالغنی، سیٹھ محمد اسحاق، نبی بخش محمد نبی، حسن علی میر محمد بلوچ اور اے آر خاں شامل تھے۔ وفد نے ایڈیشنل ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ سے مل کر درخواست کی کہ تجہیز و تکفین کے لیے عبدالقیوم کی لاش ان کے حوالے کر دی جائے۔ وفد نے ذمہ لیا کہ اس موقع پر کسی قسم کی بدامنی نہیں پھیلنے دیں گے۔

حکام کی طرف سے جواب دیا گیا کہ عبدالقیوم کے چچا اور دوسرے رشتہ دار انہیں اپنے وطن صوبہ سرحد لے جانا چاہتے ہیں اس لیے انہیں نماز جنازہ پڑھنے یا ماتمی جلوس میں شریک ہونے کی اجازت نہیں دی جا سکتی۔ وفد نے نماز جنازہ پڑھنے کی اجازت پر زور دیا۔ دوسرے دن ایڈیشنل ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ نے ایس پی بھگوان داس اور ایس پی میر مقبول خاں کی موجودگی میں وفد کو ایک تار دکھایا۔ جس میں لکھا تھا کہ جیل سپرنٹنڈنٹ کو حکم دیا گیا ہے کہ وہ تاحکم ثانی پھانسی کو ملتوی کر دے۔ وفد کو بتایا گیا کہ بعد میں مسلمان لیڈروں کو پھانسی کی تاریخ سے مطلع کیا جائے گا۔

۴ مارچ کو مسلمانوں کا ایک انبوہ کثیر کراچی جیل کے دروازے پر جمع ہو گیا کیونکہ انہیں اس بات کا یقین نہیں تھا کہ پھانسی کی تاریخ تبدیل کر دی گئی ہے۔ ان کا مطالبہ تھا کہ انہیں

جیل کی کھڑکی سے غازی عبدالقیوم کو دیکھنے دیا جائے۔ مسلم لیڈروں نے کوشش بسیار کے بعد مجمع کو یقین دلایا کہ غازی زندہ ہیں اور انہیں جب پھانسی دی جائے گی، حکام بتا دیں گے۔

۱۹ مارچ کو ۵ بجے صبح پولیس نے غازی عبدالقیوم ؒ کے رشتہ داروں کو ان کے بستروں سے جگایا اور انہیں شہر کے باہر میوہ شاہ کے قبرستان کو لے گئی۔ غازی کو صبح چار بجے نہایت خاموشی سے پھانسی دے دی گئی تھی۔ انہیں اپنے رشتہ داروں سے آخری ملاقات کرنے کی بھی اجازت نہیں دی گئی۔ پھانسی کے بعد غازی ؒ کو میوہ شاہ کے قبرستان میں پہنچا دیا گیا جہاں پہلے سے قبر تیار تھی۔

سات بجے کے قریب ایک سو کے قریب مسلمان مرد اور عورتیں وہاں جمع ہو گئیں۔ وہ غازی کا آخری دیدار کرنا چاہتے تھے۔ انہوں نے غازی ؒ کو کھلے میدان میں لے جانے کا تقاضا بھی کیا تاکہ نماز جنازہ ادا کی جاسکے۔

گیارہ بجے تک مردوں، عورتوں اور بچوں کا ایک جم غفیر جو پانچ ہزار نفوس سے کم نہ تھا، زیارت کے لیے جمع ہو گیا۔ لوگوں کے اصرار پر غازی ؒ کو ان کے حوالے کر دیا گیا۔ ہجوم ایک جلوس کی شکل میں چاکیواڑہ عید گاہ کی طرف روانہ ہوا۔

اس دوران میں ایک موٹر آئی جس میں جہانگیر پستھاکی اور رائے بہادر شورام دیوان مل (دو آنریری مجسٹریٹ) اور ایک فوجی افسر سوار تھے۔ موٹر نے عقب سے آکر مجمع کے اندر سے گزرنا چاہا۔ لوگوں نے احتجاج کیا لیکن انہوں نے متمردانہ انداز میں گاڑی نکالی۔ مجمع میں سے کسی نے گاڑی پر پتھر پھینکا جو رائے دیوان مل کو لگا تو فوجیوں نے مجمع پر گولیاں برسانا شروع کر دیں جس سے ۲۱ مارچ کو اسمبلی میں پیش کی گئی تحریک التوا پر گفتگو کرتے ہوئے کے۔ ایل گابا کے بیان کے مطابق چالیس کے قریب آدمی شہید ہوئے اور ایک سو کے قریب مجروح ہوئے۔ ایس ایم شفیع پروپیگنڈا سیکرٹری مسلم ریلیف کمیٹی کراچی کے کتابچے "عبدالقیوم کی شہادت اور کراچی کے حادثہ خونیں کے متعلق صحیح حالات" میں شہید ہونے والے مسلمانوں کی تعداد ۴۹۔ اور مجروحین کی ایک سو تھی۔ گولی بارہ بج کر چالیس منٹ پر چلائی گئی۔ اسمبلی

میں سرہنری کریک نے ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کراچی کا جو تار پیش کیا، اس میں کہا گیا تھا کہ "فسادیوں" کا واحد مقصد یہ تھا کہ ہندوؤں کے خلاف اشتعال پیدا کیا جائے۔ ایک پرشور ہجوم نے دو آنریری مجسٹریٹوں پر پتھر پھینکے اور ایک فسادی نے تو سچ مچ ایک سپاہی کی رائفل پکڑ لی"۔

سرہنری کریک نے اسمبلی میں حادثہ دہلی کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ سوامی شردھانند کے قاتل (غازی) عبدالرشید (شہید) کی نعش اس کے رشتہ داروں کے حوالے کر دی گئی تھی لیکن ان سے تحریری ضمانت لے لی گئی تھی کہ وہ خاص شرائط پر عمل پیرا ہوں گے چنانچہ وہ نعش کو قبرستان لے گئے لیکن ایک ہجوم جمع ہو گیا جس نے پولیس پر دھاوا بول کر نعش حاصل کر لی اور اسے جلوس کے ساتھ شہر لے گئے۔ ایک گھنٹہ سے کم وقت کی قلیل مدت میں ۶۲ ہندو مجروح ہوئے اور دو مارے گئے۔

قائداعظم محمد علی جناح ؒ نے اسمبلی کے مذکورہ اجلاس میں کہا کہ اگر آپ یہ چاہتے ہیں کہ ہم حکومت کا احترام کریں اور آپ پر اعتماد کریں تو حادثہ کراچی کی تحقیقات کے لیے ایک آزاد تحقیقاتی کمیٹی تشکیل دیں۔ انہوں نے اس حادثے کو انتظامیہ کی مجرمانہ غفلت قرار دیا۔

(روزنامہ "سول اینڈ ملٹری گزٹ۔ ۲۲ مارچ ۱۹۳۵ء)
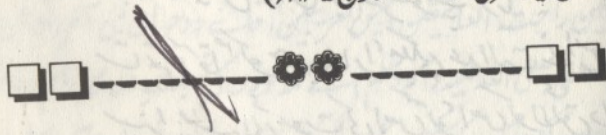
ہری پور کا سرفروش مجاہد — عبدالقیوم شہیدؒ

نُورِ نظر تھا عبداللہ کا، آقاؐ کا شیدائی تھا
مرگ و زیست کا اک اک نکتہ اس پر حق نے کھول دیا
نام اس کا عبدالقیوم تھا، شیدائی تھا آقاؐ کا
نتھو رام کو بھری عدالت میں جس نے فی النار کیا
نامعقول دلائل سارے، گستاخانہ باتیں تھیں
"تاریخِ اسلام" میں نتھو رام نے جو بھی تھا لکھا
وار کیا جب آقاؐ کے ناموس پہ ظالم شاتم نے
پھر غازیؒ کے غیظ و غضب سے وہ کیسے بچ سکتا تھا
پیشِ عدالت ٹھانی تھی، کچھ اپنے لکھے پر بات کرے
بابت بنی غازیؒ کی لیکن، اس کو خنجر گھونپ دیا
شاتمِ آقاؐ کو جب مارا، ملکی عدالت نے اس پر
سزا سنائی موت کی اس کو، اس کو لائقِ دار کیا
غازیؒ کا تاریک سا کمرہ سنٹرل جیل کراچی میں
بقعۂ نور بنا تھا پیہم، پہرے داروں نے دیکھا
سن انیس سو پینتیس میں پائی تھی شہادت غازیؒ نے
غازی قصبے کا یہ باسی میوہ شاہ میں دفن ہوا

راجا رشید محمود

شُدھی تحریکؒ کے بانی شردھانند کے قاتل

غازیؒ عبدالرشید قاضی شہیدؒ

تحریر: رائے محمد کمال

بھارت کی راجدھانی کے چاندنی چوک پر موتی مسجد واقع ہے۔ اس کے سامنے دھلی کارپوریشن کا مرکزی دفتر ہے۔ اگر بلدیہ کے مین گیٹ سے اندر داخل ہوں تو صحن میں نصب ایک مجسّمہ نظر پڑے گا۔ یہ بُت ایک دہن دراز آریہ سماجی لیڈر گستاخِ رسولؐ سوامی شردھانند کا ہے۔ اس نے بڑے متعصّبانہ رنگ میں شدھی تحریک چلائی۔ مقصد یہ تھا کہ ہندوستان کے طول و عرض میں موجود پیروکارانِ اسلام کو کسی طرح دوبارہ ہندو بنایا جائے۔ دوسری طرف ہندوؤں کے اذہان میں نظریہ سنگھٹن بٹھایا گیا کہ بزورِ شمشیر مسلمانوں کو ہندومت میں واپس لایا جائے یا ان کو تہِ تیغ کر دیا جائے۔ فساد و شر کے اس اوتار نے اعلان کیا کہ ہم نے اوم کا جھنڈا صرف بھارت میں لہرایا ہے۔ آگے چل کر شدھی کی تحریک ہم ساری دُنیا میں پھیلائیں گے اور اوم کا جھنڈا کعبہ پر بھی لہرائیں گے۔

چونکہ دشمنانِ اسلام بخوبی آگاہ ہیں کہ جب تک خاتم النبیین سید المرسلین رحمۃ للعالمین شفیع المذنبین راحت العاشقین انیس الغریبین آقائے دوجہاں نبیِ آخر الزماں احمد مجتبےٰ حضرت محمد مصطفیٰ (صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم) سے کلمہ گوؤں کی نسبتِ غلامی قائم و دائم ہے، وہ مطلوبہ مقاصد ہرگز حاصل نہ کرسکیں گے۔ اگر رُوحِ محمد (صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم) ان کے بدن میں موجود رہے تو دُنیا کی کوئی طاقت انہیں موت سے نہیں ڈرا سکتی اور اگر خوفِ مرگ پیدا نہ ہو تو طوفان سے ٹکراتے رہنا ایک دلپذیر شغلہ بن جاتا ہے۔ لہذا انہی مصلحتوں کے سبب ابلیس کی مجلسِ شوریٰ میں فیصلہ ہوا کہ پہلے پہل اہلِ ایمان کے دلوں سے عشقِ رسول (صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم) کی چنگاری بجھا دی جائے۔ یہ گھناؤنے عزائم تھے جس کے پیشِ نظر آریہ سماج کا تخفص اُجاگر کیا گیا اور برصغیر پاک و ہند میں کو یکو ایک گہری اور منظم سازش کے تحت تحریکِ

شماتتِ رسولؐ شروع ہوئی۔

اس کی پہلی واضح علامت آنجہانی دیانند سرسوتی کے انتہا پسند چیلے سوامی شردھانند کی صورت میں سامنے آئی۔ اس کا مرکز دہلی تھا۔ مسلمانوں کی دل آزاری، ضبطیٔ قرآن کی جدّوجُہد مشاہیرِ اسلام پر گستاخانہ تبصرے۔ اولیاءِ کرام کی توہین، صحابہ کرامؓ کے متعلق مغلظات اور بکواس، شانِ اہلبیتؓ میں ہرزہ سرائی، امہات المؤمنینؓ کو گالیاں اور سرکارِ مدینہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی حرمت و تقدیس کو نشانۂ سبّ وشتم بنانا ہی اس کا مقصدِ حیات تھا وہ برملا کہا کرتا تھا کہ اگر ہندو بقا چاہتے ہیں تو ان پر لازم ہے کہ وہ مسلمانوں کو فنا کر دیں۔ ہمارا موضوع فی الحال اس مردودِ رسالت پناہؐ پر شہبازِ عشق کے جھپٹنے پلٹنے اور پلٹ کر جھپٹنے تک محدود ہے۔

دسمبر ۱۹۲۶ء کا واقعہ ہے۔ سوامی شردھانند دہلی میں اپنے نیا بازار والے مکان پر موجود تھا کہ ایک غیرت مند نوجوان نے اُسے للکارا اور پے در پے پستول سے فائر کر کے دشمنِ رسولؐ کو کیفرِ کردار تک پہنچا دیا۔ حملہ آور نے تاریخ میں غازی عبدالرشید شہیدؒ کے نام سے شہرت پائی۔

بلند شہر اور میرٹھ کے بارہ دیہات وقصبات پر مشتمل ایک علاقہ بارہ بستی افغانان کے نام سے مشہور ہے اور اس کا مرکزی مقام قصبہ بگراسی ضلع بلند شہر میں ہے۔ قاضی عبدالرشید صاحبؒ بگراسی کے ایک علمی معزز گھرانے میں پیدا ہوئے۔ آپ نے عربی و فارسی کی ابتدائی تعلیم اپنے تایا زاد بھائی مولانا قاضی سید محمد بشیر سے حاصل کی اور درسِ نظامی کے لیے گلاوٹھی کے ایک عربی مدرسہ میں داخلہ لے لیا۔ ازاں بعد آپ اپنے والدین کے ہمراہ بگراسی سے ترکِ سکونت کر کے دہلی میں آ بسے۔ غازی عبدالرشید شہیدؒ پر مذہب کی گہری چھاپ تھی اور عشقِ رسول (صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم) اُن کا سرمایہ حیات ——

دیوان سنگھ مفتون نے اپنی مشہور کتاب "ناقابلِ فراموش" میں سوامی شردھانند کے واقعہ قتل کے بارے میں لکھا ہے "میں فوراً سوامی جی کے نیا بازار والے مکان پر پہنچا۔ اس وقت واقعہ کو ہونے ایک گھنٹہ سے کم عرصہ ہوا تھا۔ سوامی جی مقتول حالت میں خون سے

لت پت لکڑی کے تخت پوش پر پڑے تھے۔ قاتل عبدالرشید حراست میں تھا۔ ہزاروں لوگ جمع تھے اور شیخ نذیر الحق انسپکٹر پولیس ابتدائی تحقیقات میں مصروف تھے۔ میں نے جب عبدالرشید کو دیکھا تو میں نے پہچان لیا کیونکہ ایک یا دو سال پہلے یہ دفتر "ریاست" میں کتابت کا کام کر چکا تھا" —— اس کے بعد مصنّف نے غازی عبدالرشید شہیدؒ کے بارے میں اپنی یادداشتیں قلمبند کی ہیں۔ لکھتے ہیں "افغانستان میں کنگ امان اللہ کے حکم سے چند احمدی سنگسار کر دیے گئے جو وہاں اپنے احمدی خیالات کی تبلیغ کرتے تھے۔ چنانچہ میں نے اس واقعہ کو بیان کرتے ہوئے افغان گورنمنٹ کے خلاف ایک سخت ایڈیٹوریل نوٹ لکھا اور یہ نوٹ اس کاتب عبدالرشید (سوامی شردھانند کے قاتل) کو کتابت کے لیے دیا۔ عبدالرشید نے ابھی چند سطروں کی کتابت کی تھی کہ وہ میرے پاس آیا۔ اس کی آنکھیں سُرخ تھیں۔ چہرے پر غُصّے کے جذبات تھے اور اس نے کہا "آپ کو شرعی معاملات میں دخل دینے کا کیا حق ہے؟ اسلام کی تعلیم کے مطابق سنگساری جائز ہے اور احمدیوں کو ضرور سنگسار کیا جانا چاہیے تھا۔ کیونکہ یہ اپنے مرزا قادیان کے نبی ہونے کے دعویدار ہیں۔ میں کافرانہ نوٹ نہیں لکھ سکتا"۔ —— ایک غیر مسلم مؤلف کی یہ گواہی غازی موصوف کی حقیقت پسندی جرأت ایمانی اور خوفِ خدا کا زندہ جاوید ثبوت ہے۔ سچ ہے جو سرِ دار نہ ہو وہ سردار نہیں ہوتا۔

قاضی عبدالرشیدؒ کے دل میں انگریزوں کی مخالفت کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ آپ نے ایک بہت بڑی تحریک میں نہایت مردانگی کے ساتھ اپنا مشکل ترین فریضہ بھی نبھایا۔ حکیم اجمل خاں نے مولانا محمد علی جوہر اور ڈاکٹر انصاری وغیرہ کے مشورہ سے شاہِ افغانستان کے نام ایک خط لکھا تھا جس میں درخواست کی گئی کہ آپ ہندوستان پر حملہ کر دیں۔ یہاں اس وقت انگریز کے خلاف مسلمانوں اور ہندوؤں میں بڑا اتفاق ہے۔ یہاں کے سب لوگ آپ کا ساتھ دیں گے اور ان شاءاللہ فتح ہوگی اور آپ کے ذریعے ہندوستان میں پھر مسلمانوں کی حکومت قائم ہو جائے گی۔ اس مکتوب کو شاہِ افغانستان تک پہنچانے کے لیے حکیم صاحب کی نظرِ انتخاب آپ ہی پر پڑی۔

الغرض غازی صاحبؒ نے شاتم نبیؐ سوامی شردھانند کو واصل جہنّم کر چکنے کے بعد جائے واردات سے فرار ہونے کی قطعاً کوشش نہ کی بلکہ بصد شوق گرفتاری کے لیے پیش کر دیا۔ جب آپ کو ہتھکڑی پہنائی گئی تو فرمانے لگے۔ "یہ تو راہِ شوق میں پھولوں کے گجرے ہیں"۔ پولیس نے تفتیش کی غرض سے آپ کو چودہ پندرہ دن حراست میں رکھا اور جنوری ۱۹۲۷ء میں اس مقدمے کی باقاعدہ سماعت ہوئی۔ چونکہ آپ برضا و رغبت ہر جگہ فخریہ انداز میں اقرارِ قتل کر رہے تھے اس لیے سزائے موت یقینی تھی۔ بہر حال آپ کے چاہنے والوں نے پریوی کونسل تک مقدمہ لڑا مگر حسبِ توقع فیصلہ وہی رہا تھا۔ اپیلیں مسترد ہونے پر آپ کو ۱۴ نومبر ۱۹۲۷ء کے روز تختۂ دار پر لٹکانے کا فیصلہ کیا گیا۔

جیل میں آخری ملاقات کے لیے ان کے گھر کی سات آٹھ عورتوں اور بیس مردوں کو اجازت مل سکی۔ آپ نے دورانِ ملاقات متبسم لہجے میں فرمایا۔ "آپ لوگ کسی طرح کا غم نہ کریں۔ یہ تو مقامِ مسرت ہے کہ مجھ جیسا گنہگار محبوبِ خدا (صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم) کی حرمت و تقدیس کے لیے اپنی جان نچھاور کر رہا ہے۔ مذہب کے سلسلے میں کسی کی پروا نہ کرنی چاہیے اور مذہب پر ہر وقت ثابت قدم رہنا ہی اصل عبادت ہے"۔

بتایا جاتا ہے کہ آپ پر کسی قسم کا خوف و ہراس نہیں تھا بلکہ چہرے سے ایک خاص قسم کی طمانیت جھلک رہی تھی۔ داروغۂ جیل نے جب آپ کو آگاہ کیا کہ آج آپ کو پھانسی دی جانے والی ہے تو قاضی صاحبؒ نے فرمایا۔ "الحمد للہ، اس سے بڑھ کر میرے لیے اور کیا خوش خبری ہو سکتی ہے"۔ یہ اطلاع ملتے ہی ان کا چہرہ تمتمانے لگا اور آنکھوں میں مقدّس روشنی عود کر آئی ـــــ غازی عبدالرشید شہیدؒ نے ایک دفعہ ملاقات کے دوران اپنے قریبی احباب کو یہ بات بتائی کہ میں نے مقتول مردود کو موت سے ہمکنار اس لیے کیا کہ خواب میں سیّدالشہدا حضرت امام حسینؓ نے مجھ سے فرمایا تھا۔ "تمہارے شہر میں میرے نانا، نبی کریم رؤف الرحیم (صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم) کی توہین کی جا رہی ہے اور تم خاموش بیٹھے ہو"۔

آپ نے جملہ مسلمانوں کے نام اپنے آخری پیغام میں کہا۔ "آپ کو ہر حال میں دینی اقدار

سے وابستہ و پیوستہ رہنا چاہیے اور مذہبی فرائض کی انجام دہی میں کسی قسم کا خوف نہ رکھنا چاہیے"۔ شمعِ رسالت کے اس پروانہ کو رسول پاک (صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم) سے قلبی لگاؤ تھا۔ حضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی شان میں ان کو ادنیٰ سی گستاخی بھی برداشت نہ تھی۔ انھوں نے اپنے اس عقیدہ کو عملاً سچ کر دکھایا ـــــ غازی عبدالرشیدؒ کو ۱۴ نومبر ۱۹۲۷ء کی صبح آٹھ بجے پھانسی دی گئی۔ کہا جاتا ہے کہ جس وقت پھانسی گھر میں پہنچائے گئے تو اُن کے ہونٹوں پر مسکراہٹ نمایاں تھی۔ آپ نے خصوصی اجازت سے تختۂ دار پر دو رکعت نوافل شکرانہ ادا کیے۔ جب آپ کے چہرے پر کنٹوپ چڑھایا گیا تو باآوازِ بلند کلمۂ طیّبہ کا ورد کیا اور فرمایا۔ "آپ لوگ شاہد رہیں کہ میں ایمان کے ساتھ اس دُنیا سے سفر کر رہا ہوں۔ پھر کلمہ شریف پڑھا۔ "اللہ اکبر" کی آواز بلند کی اور اس کے ساتھ ہی پھانسی پر لٹک گئے۔ غازی عبدالرشیدؒ کے جسم پر پھانسی کی کوئی علامت موجود نہ تھی۔ گردن میں کھچاؤ تھا اور نہ ہی بدن میں کوئی سختی۔ ڈیوٹی پر موجود ڈاکٹر صاحب نے موت کی تصدیق کرتے ہوئے کہا۔ "میرے خیال میں جب آپ نے تختۂ دار پر کھڑے ہو کر نعرۂ تکبیر بلند کیا تو ان کے جسدِ عنصری سے اسی لمحے روح پرواز کر گئی تھی"۔

جب آپ نے جامِ شہادت نوش فرمایا، اس دن جیل کے اندر کپتان پولیس مسٹر ٹوئس، سٹی مجسٹریٹ مخدوم غلام مصطفیٰ، مجسٹریٹ درجہ اوّل اور سول سرجن موجود تھے لیکن جیل کے باہر چاروں طرف مسلمانوں کا مجمع ایک محتاط اندازے کے مطابق اسّی ہزار تک پہنچ گیا تھا۔ جس نے حصولِ نعش کے لیے اپنی جانیں تک وار دینے کی قسم کھائی۔ انتظامیہ نے اس جمّ غفیر کو منتشر کرنے کی ہر ممکن کوشش کی اور کہا گیا کہ لاش اس صورت میں دی جا سکتی ہے کہ تم لوگ کسی قسم کا شور اور فساد نہ کرو اور سامنے قبرستان میں دفن کر دو۔ میّت کو جیل کے اندر ہی غسل دیا گیا۔ دس بجے کے قریب یکایک شور اُٹھا کہ نعش دوسرے دروازے سے بھیج دی جائے گی۔ لوگ فوراً ادھر کو دوڑے اور صدائے تکبیر بلند کی۔ مسلمانوں کی جماعت کے ایک ریلے میں جیل کے بیرونی احاطے کا پھاٹک بھی ٹوٹ گیا۔ بہر حال لاش بارہ بجے دوپہر ان کے حوالے کی گئی۔ اس وقت تک دہلی جیل کے سامنے دو لاکھ سے زائد افراد جمع ہو چکے

تھے ۔ یہ دردمند مسلمان آپ کے جنازے میں شریک ہونے کے لیے چاروں طرف کے اضلاع سے آئے تھے ۔ حکم تھا کہ شہیدؒ کی نعش جیل کے قریب کوٹلہ فیروز کے سامنے والے قبرستان میں دفن کی جائے مگر پرجوش کلمہ گوؤں کی تمنا تھی کہ وہ اس پروانۂ شمع رسالتؐ کی نعش کا جلوس پورے شہر سے پھرا کر حضرت خواجہ باقی باللہؒ کی درگاہ میں دفنائیں گے۔ القصہ جنازے کا جلوس جب قطب روڈ سے خواجہ باقی باللہؒ کی طرف مڑا تو وہاں دو گاڑیاں پولیس کی، ایک مشین گن اور گورا فوج موجود تھی ۔ انہوں نے تابوت چھین لیا اور بحفاظت جدید قبرستان میں لے آئے اس جگہ شہیدِ موصوفؒ کے والد اور بھائی وغیرہ بیٹھے ہوئے تھے۔ ان سے کہا گیا کہ فوراً دفن کر دو۔

قاضی مبشر حسن راغب ہاشمی اس فداکارِ رسالت کے پسماندگان کے بارے میں فرماتے ہیں ۔" غازی عبدالرشید شہیدؒ کی بیوہ لیڈی ڈاکٹر اصغری بیگم کا ۷ مئی ۱۹۴۹ء کو کراچی میں انتقال ہو گیا ۔ آپ کے ایک بھائی مولوی قاضی جمیل احمد کا انتقال نومبر ۱۹۴۸ء کو کراچی میں ہوا اور آپ کے سب سے چھوٹے بھائی مولوی قاضی خلیل احمد بحمد اللہ بقیدِ حیات ہیں ۔ اور اپنا وقت زہد و عبادت میں صرف کرتے ہیں اور آپ کا قیام لیاقت آباد کراچی میں ہے ۔ شہید ممدوح مرحوم و مغفور کے صاحبزادے مولوی حکیم قاضی محمود الحسن صاحب دہلی میں مقیم ہیں ۔

غازی عبدالرشید شہید رحمۃ اللہ علیہ

جو مر کر زندۂ جاوید ہو گئے

تحریر: ابوالفضل صدیقی

۲۳ دسمبر ۱۹۲۶ء کی ایک صبح کا ذکر ہے۔

میں اپنے قصبے کے سب سے بڑے بزاز سیٹھ گوپال داس سری رام کی دکان سے کپڑا خرید رہا تھا ۔ اچانک ایک ہندو بھاگا ہوا آیا اور سیٹھ کو مخاطب کرتے ہوئے بولا :

"سیٹھ جی ! غضب ہو گیا، ایک ملیچھ مسلمان نے سوامی شردھانند جی کو شہید کر دیا۔"

یہ خبر آگ کی طرح آناً فاناً پورے شہر میں پھیل گئی ۔ ہندو دکانیں بند کرنے لگے ۔ اور مسلمانوں کے خلاف نعرے گونجنے شروع ہو گئے ۔ دوسری طرف مسلمانوں نے اس واقعے پر اظہارِ مسرت کیا ۔ لوگوں نے خوشی میں بتاشے بانٹے، بعض نے محفلِ میلاد کرائی ۔ اگلے روز نمازِ شکرانہ ادا کی گئی ۔

شردھانند ہندو مسلم فساد کا داعی اور رسوائے زمانہ شدھی تحریک کا بانی تھا ۔ اس کا اصل نام منشی رام تھا ، مگر سیاست میں قدم رکھنے کے بعد سوامی شردھانند کہلانے لگا تھا ۔ اس کا شمار ہندوستان کے ان مخصوص افراد میں ہوتا ہے جنہیں انگریز نے ہندوؤں کو مسلمانوں کے مقابلے میں کھڑا کرنے اور ہندو قوم کو مضبوطی سے جمانے کے لیے اپنا آلۂ کار بنایا ۔ وہ بنارس کا رہنے والا تھا ۔ عملی زندگی کا آغاز پولیس میں چھوٹے سے چھوٹے عہدے (غالباً سب انسپکٹر) سے کیا ۔ وہاں قدم نہ جمے ، تو محکمۂ قانون میں "مختارِ عدالت"

بن گیا۔ یہاں سے طبیعت اُچاٹ ہوئی، تو سنیاس لے لی اور چار اَبرو کا صفایا کرا کے
ہردوار میں جا دھونی رمائی۔ پھر سیاست میں حصہ لینے کا شوق چرایا، تو کانگریس میں شامل
ہو گیا۔ پولیس اور قانون کے محکموں میں ملازمت، مذہبی دائرے میں کام کرنے اور
آخر میں سیاست میں حصہ لینے سے اسے گوناگوں معلومات حاصل ہو گئیں۔ قدرت
نے تیز ذہن اور غیر معمولی قوتِ حافظہ دی تھی۔ زندگی کے مختلف شعبوں میں کام کرنے
سے ذہن اور بھی منجھ گیا۔ زمانہ شناسی اور حاضر جوابی میں اپنی مثال آپ تھا۔ اپنی ذہانت و
خطابت کے باعث آنے والے طوفان کے تیور بہت پہلے بھانپ لیتا تھا۔ ہندو مذہب اور
فلسفے پر گہری نظر تھی۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ ساحرانہ خطابت میں اس کا کوئی ثانی نہ تھا۔

کانگریس میں آئے تھوڑے ہی دن گزرے تھے کہ ۱۹۲۰ء میں تحریکِ ترکِ موالات
میں دھر لیا گیا۔ جیل کی سختیوں کے سامنے بہت جلد ہمت ہار بیٹھا اور جیل کے انگریز افسروں
سے ہندو مسلم اتحاد کے خلاف تحریک چلانے کی ساز باز شروع کر دی۔ انگریز ڈپلومیسی ایسے
"جوہرِ قابل" کی تلاش میں ہمیشہ رہتی تھی، فوراً سودا طے ہو گیا۔ چند روز کے بعد دنیا نے
دیکھا کہ کانگریس کا سرگرم کارکن اور ہندو مسلم اتحاد کا خواہاں منشی رام گیروا کپڑوں میں
ملبوس جیل سے نکلا تو سوامی شردھانند بن چکا تھا۔

نیا بہروپ بھرنے کے بعد شردھانند، دیانند سرسوتی کی تحریک آریہ سماج سے وابستہ
ہو گیا۔ کچھ مدت بعد شدّھی اور سنگھٹن کی تحریکیں شروع کیں۔ ان تحریکوں کا ظاہری
مقصد تو ہندو سماج کی اصلاح اور چھوت چھات کا خاتمہ تھا لیکن اصل کام مسلمانوں کو
اسلام سے برگشتہ کر کے ہندو مت کے دائرے میں لانا تھا۔ چونکہ یہ سب کچھ انگریز
حکومت کے اشارے اور اُس کی منصوبہ بندی کے مطابق کیا جا رہا تھا، اس لیے اُس نے
شردھانند کی خوب پیٹھ ٹھونکی، ہر طرح کی مالی امداد دی اور ہر مشکل مرحلے میں اس کا
ساتھ دیا۔ شردھانند پہلے ہی بڑا شاطر اور عیّار تھا، انگریز کی پشت پناہی سے دو آتشہ

ہو گیا۔ اس نے دلّی کو شدّھی تحریک کا مرکز بنایا اور لاہور میں ذیلی دفتر قائم کیا۔ ان دونوں
شہروں میں بڑے آشرم قائم کیے جن کا مقصدِ وحید مسلمانوں کی مخالفت اور ان کے خلاف
نفرت ابھارنا تھا۔ اس تحریک کو ایسی مقبولیت حاصل ہوئی کہ قلیل سی مدت میں بہت سے
نامور صحافی، مقرر، اہلِ قلم، پروفیسر، دانشور اور مذہبی رہنما اس میں داخل ہو گئے جن میں
سے پنڈت مدن موہن مالوی، پروفیسر دیش بندھو گپتا، بھائی پرمانند اور مہاشہ کرشن کے
نام قابلِ ذکر ہیں۔ ساتھ ہی نقالوں، یاوہ گویوں، ہرزہ سراؤں اور تخریب پسندوں کا
ایک ٹولہ اس تحریک میں آگھسا، جس نے مسلمان سلاطین، اولیاء، صوفیا، اکابرینِ ملت،
بزرگانِ دین، اسلام اور قرآنِ پاک کے خلاف افترا پردازی، بہتان تراشی اور دشنام طرازی
کا محاذ کھول دیا۔

دہلی اور لاہور میں آشرم کے کارکنوں نے ذہنی خباثت کا وہ مظاہرہ کیا کہ الامان والحفیظ۔
ملتِ اسلامیہ کے قائدین ایک عرصہ تک ان تحریکوں کی سرگرمیاں برداشت کرتے رہے،
لیکن جب قوتِ برداشت سے باہر ہو گیا، تو جوابی قدم اُٹھایا۔ اس سلسلے میں خواجہ حسن
نظامیؒ نے "تبلیغ" کے نام سے ایک تنظیم بنائی اور اپنے اخبار "منادی" میں ان کی خرافات
کا سختی سے نوٹس لیا۔ مولانا ظفر علی خان نے "زمیندار" میں منہ توڑ جواب لکھے۔ مولانا شوکت علی
اور مولانا غلام بھیک نیرنگ کے علاوہ دیوبند اور فرنگی محل کے علماء نے بھی قلمی جہاد میں
حصہ لیا۔ تاہم آریہ سماج والے جس فحش زبان اور گندے لہجے میں بولتے تھے اور اخلاق
کی جس نچلی سطح تک گر جاتے تھے، وہ مسلمانوں کے بس کا روگ نہ تھا، چنانچہ شردھانند
اور اس کے ساتھیوں کے حوصلے روز بروز بڑھتے چلے گئے۔ انہوں نے ہندو عوام کو یقین
دلانا شروع کر دیا کہ شدّھی تحریک دہلی اور لاہور کو فتح کرتی ہوئی پشاور سے رنگون اور میسور
سے کمایوں گڑھوال تک پورے ہندوستان کے ایک ایک مسلمان کو شدھ کر لے گی۔ پھر
افغانستان، ایران، ترکی و مصر کے علاوہ ایشیا اور افریقہ کے مسلمان ملکوں کو اپنے جھنڈے تلے

لے آئے گی۔ اِن لوگوں نے شدھی تحریک کے منشور کے ساتھ ایک نقشہ بھی شائع کیا اور
خانہ کعبہ پر "اوم" کا جھنڈا لہرانے کی متوقع تاریخ کا بھی اعلان کر دیا۔

اہلِ دانش تو اس ڈھونگ کی حقیقت جانتے تھے، لیکن عام ہندو جو نو سو سال
مسلمانوں کی غلامی رہ چکے تھے اور اب ایک سو سال سے انگریز کے محکوم تھے، اس قسم
کے حسین خوابوں کو حقیقت سمجھنے لگے، چنانچہ شودر اور اچھوت بڑھ چڑھ کر اس
تحریک میں حصہ لینے لگے۔ انہیں ہندو قوم کی دولت مندی اور عددی قوت کا احساس
تھا، ساتھ ہی وہ مسلمانوں کی معاشی اور سیاسی کمزوریوں سے بھی آگاہ تھے، اس لیے
انہیں یہ گمان ہو گیا کہ خانہ کعبہ پر نہیں، تو کم از کم دہلی اور لاہور کی جامع مسجدوں پر تو
اوم کا جھنڈا لہرانے سے انہیں کوئی نہیں روک سکتا۔ علی برادران اور دوسرے
مسلمانوں راہنماؤں نے کانگریس کی طرف دستِ تعاون بڑھا کر خلافت کانفرنس
کے زمانے میں ہندو مسلم اتحاد کی جو فضا برسوں میں تیار کی تھی، شدھی تحریک اور
شردھانند کے چیلوں نے چند مہینوں میں اسے نفرت و انتشار میں بدل دیا۔

ان لوگوں نے اسلام، قرآن اور مسلم قوم کے خلاف اتنی ہرزہ سرائی کی کہ
مسلمانوں میں اشتعال پیدا ہونے لگا۔ یہ لوگ شہروں سے نکل کر گاؤں گاؤں اور
قریہ قریہ میں پھیل گئے اور اسلام پر کیچڑ اچھالنے لگے۔ نوبت یہاں تک پہنچ گئی کہ
ہندو استریاں بھی ان کے دوش بدوش میدان میں نکل آئیں اور کھلی گاڑیوں
میں "شدھ ہو جاؤ اور پسند کر لو" کے پوسٹر آویزاں کر کے جلوس نکالنے لگیں۔

یہی نہیں، اِن دریدہ دہن بدبختوں نے اسلام اور قرآنِ پاک کے خلاف
افسانہ تراشیوں کے بعد براہِ راست ناموسِ رسالتؐ پر حملے شروع کر دیے۔
مسلمانوں کی قوتِ برداشت پہلے ہی جواب دے چکی تھی۔ رسولِ اکرم صلی اللہ
علیہ وآلہ وسلم کی حرمت و ناموس پر آنچ آتے دیکھ کر وہ تلملا اُٹھے۔ اس موقع پر

"مردے از غیب بروں آید و کارے بکند" کے مصداق ایک عاشقِ رسولؐ اُٹھا اور اس تمام
فتنہ و شر کے بانی شردھانند کو واصلِ جہنم کر کے مسلمانوں کے زخمی دلوں پر مرہم رکھا۔ اس
پروانۂ رسالتؐ کا نام قاضی عبدالرشید تھا۔ شردھانند کے قتل کے بعد قوم نے اسے
"غازی" اور تختۂ دار پر مردانہ وار جان فدا کرنے پر "شہید" کے لقب سے نوازا۔

قاضی عبدالرشید یوپی کے ایک چھوٹے سے ضلع کے کسی غیر معروف گاؤں کے
باسی تھے۔ ابتدائی تعلیم کے بعد کتابت سیکھی اور اسی کو ذریعۂ معاش بنا لیا۔ حصولِ معاش
کے سلسلے میں اپنے وطن سے ترکِ سکونت کر کے دلی آئے اور پھر مستقلاً یہیں قیام کر لیا۔
وہ بوڑھی ماں، ایک بیوہ بہن، جواں سال بیوی اور دو بچوں پر مشتمل خاندان کے کفیل
تھے۔ گھر میں نماز روزے کی سختی سے پابندی کی جاتی تھی۔ قاضی صاحب مختلف اخبارات
اور رسائل میں کتابت کر کے صرف اس قدر کما لاتے تھے جس سے دو وقت کی روٹی
میسر آ سکے۔ تھے تو غریب مگر بڑے خوددار، قناعت پسند اور معاملے کے کھرے۔
نہ کسی کے آگے دستِ طلب دراز کرتے، نہ کسی آجر کی طرف ایک پائی چھوڑتے۔ وہ اکثر
"نظام المشائخ"، "عصمت"، "منادی" اور "دین و دنیا" میں کتابت کرتے تھے۔
فطری طور پر حساس، کم آمیز اور کم سخن تھے، مذہب سے وابستگی ان کی گھٹی میں پڑی
تھی۔ دہلی کے صوفیا اور علماء کرام کی صحبتوں نے سینے کو اسلام، قرآن اور رسولِ اکرمؐ
سے عشق اور عقیدت سے بھر دیا تھا۔ مولانا رازق الخیری کا بیان ہے۔

"جبلتاً مخصوص نوعیت کے جذباتی نوجوان تھے۔ ذاتِ رسالت مآبؐ سے
انہیں عشق کی حد تک وابستگی تھی۔ رسولِ پاکؐ کی شان میں شدھی والے جو گستاخیاں
کرتے تھے انہیں پڑھ اور سُن کر وہ تڑپ اُٹھتے تھے، کبھی کبھی جوشیلے انداز میں اس
اذیت کا اظہار کرتے، تو سننے والوں کو بھی تڑپا دیتے۔"

جناب صادق الخیری اور ملا واحدی (جن کے ہاں وہ کام کیا کرتے تھے) فرماتے ہیں:

"وہ خاموش طبع اور داخلی طور پر بے چین طبیعت کے مالک تھے۔ اس موضوع پر بہت کم بولتے تھے، لیکن جب بولتے تو دل کے تمام زخم نمایاں کر دیتے۔ جس سے اندازہ ہوتا کہ اس معاملے میں وہ شدید داخلی ہیجان میں مبتلا ہیں اور ہمہ وقت اُبلتے رہتے ہیں۔ زُود نویس کاتب تھے۔ اس لیے انہیں ہر ادارے میں پذیرائی حاصل تھی، لیکن ان کی متلون مزاجی اور تیکھا پن انہیں ٹِک کر کام نہ کرنے دیتا تھا۔"

اسی سلسلے میں مولانا رزاق الخیری کا بیان ہے:

"وہ اکثر خواجہ حسن نظامیؒ، مُلّا واحدی اور ہمارے ہاں کام کرتے تھے۔ بڑے شائستہ، غریب طبیعت اور مسکین صفت تھے۔ ان کی کم آمیزی اور کم گوئی کے باوجود ہم اُن کی فطرت کے اتنے محرم ہو گئے تھے کہ اُن کے اس اقدام پر چنداں حیرت نہ ہوئی کیونکہ رسولؐ پاک کی توہین و تضحیک بھرے کلمات پڑھ کر اور سُن کر اُن کے سینے میں جوالا مُکھی اُبلنے لگتا تھا اور ہر وقت اندیشہ رہتا تھا کہ نہ معلوم یہ لاوا کس وقت اُبل پڑے۔ دشمنِ رسولؐ، شردھانند کو جہنم رسید کر کے اُنہیں چین سا آ گیا تھا۔ دن دہاڑے اتنا بڑا اقدام کرنے کے باوجود وہ چنداں ہراساں نہ ہوئے، بلکہ تختۂ دار پر جامِ شہادت نوش کرنے تک انہیں پورا اطمینان قلب حاصل تھا۔ کہنے کو تو مزدور پیشہ کاتب تھے، لیکن عشقِ رسولؐ اور جذب و مستی کے طفیل اس منزل پر پہنچے کہ جہاں عقل ارتداد اور مصلحت بُزدلی بن جاتی ہے۔ نصف ارب مسلمانوں کی طرف سے فرضِ کفایہ ادا کر کے سچے عاشقوں اور رازدانوں کی صف میں جا کھڑے ہوئے۔ مانا کہ بے کس و بے بس اور بے زر و بے پَر تھے، لیکن بلند نصب العین کی پرواز تو عرش بریں تک ہوتی ہے۔ اس کی بدولت وہ اس مقام تک جا پہنچے جہاں ملکِ خدا کی وسعتیں سمٹ جاتیں اور اور پائے استقامت کے تلوے چاٹتی ہیں۔"

آریہ سماجیوں اور شُدھی والوں کے نت نئے فتنے اُٹھتے، تو عبد الرشید دل ہی دل

میں سوچا کرتے کہ فتنہ و شر کے اس سلسلے کو کیسے ختم کیا جائے، بالآخر ان کے ذہن میں ایک تجویز آ گئی۔ انہوں نے رسالتمآبؐ پر کیچڑ اُچھالنے والے گروہ کے سرغنے کا قصّہ پاک کرنے کی ٹھان لی۔ چند ہی دن کے بعد شمعِ رسالتؐ کا یہ پروانہ دہلی سے افغانستان روانہ ہو گیا۔ وہاں سے ایک پستول اور چند گولیاں خریدیں اور لوٹ آیا۔ اس زمانے میں انگریزی نظم و نسق چونکہ شباب پر تھا، اس لیے ہندوستان میں کسی آتشیں اسلحے کا حاصل کرنا آسان نہ تھا۔ گو، بھوپال، رام پور اور جے پور جیسی ریاستوں میں یہ چیزیں مل جاتی تھیں، لیکن قاضی عبد الرشیدؒ جیسا شخص جس کی پشت پر نہ کوئی بڑی شخصیت تھی نہ تنظیم، ایسی چیز کیسے حاصل کر سکتا تھا۔ مجبوراً انہیں افغانستان کا سفر کرنا پڑا۔

افغانستان سے واپسی کے بعد وہ موقع کی تلاش میں رہنے لگے۔ قدرت نے جلد ہی موقع فراہم کر دیا۔ ۱۷ دسمبر ۲۶ء کو شردھانند صاحبِ فراش تھا اور اپنے مرکزی دفتر میں قیام پذیر تھا۔ قاضی عبد الرشید نے اپنے منصوبے کو عملی جامہ پہنانے کا فیصلہ کر لیا۔ ریوالور لے کر دن دہاڑے شردھانند کے آشرم میں جا گھسے۔ حُسنِ اتفاق سے اس وقت اس دریدہ دہن کے پاس کوئی خادم نہ تھا۔ غازی نے ایک ثانیے کے لیے رُک کر کمرے کا جائزہ لیا اور پھر لبلبی دبا کر پے در پے چھ گولیاں دشمنِ رسولؐ کے سینے میں پیوست کر دیں۔ گولیاں چلنے کی آواز سُن کر ساتھ کے کمروں سے آشرم کے کارکن بھاگے اور غازی کو فرار ہونے سے قبل ہی پکڑ لیا۔

شردھانند کے قتل سے ہندو حلقوں میں صفِ ماتم بچھ گئی۔ ادھر مسلمانوں نے بے انتہا خوشی کا اظہار کیا۔ انگریز حکومت نے اپنے ایجنٹ کا یہ انجام دیکھا، تو آپے سے باہر ہو گئی۔ مسلمانوں کے خلاف سخت اقدامات کیے۔ ہندوؤں کی پیٹھ ٹھونکی اور کہا کہ وہ مقدمے کو جاندار بنا کر پیش کریں۔

حکومت کی طرف سے شہ ملنے پر ہندو جاتی کے حوصلے بلند ہو گئے۔ انہوں نے

اس کیس کو گہری سازش ثابت کرنے کے لیے توڑ جوڑ شروع کر دیے۔ غازی عبدالرشیدؒ
چونکہ خواجہ حسن نظامیؒ کے ہاں بھی کبھی کبھی کام کیا کرتے تھے، اس لیے انہیں اس
قتل میں ملوث کرنے کا پروگرام بنایا گیا تھا۔ اتفاق سے ایک بنک کے اہل کاروں کو
اس سلسلے میں تھوڑا سا مواد مل گیا۔ اسی کی بنا پر سازش کی عمارت کھڑی کر دی گئی کہ
سوامی شردھانند کو خواجہ حسن نظامیؒ نے معاوضہ دے کر قتل کرایا ہے۔

اس داستان کا پس منظر یہ ہے کہ دہلی کے ایک بنک (غالباً انڈین نیشنل بنک)
میں خواجہ صاحب کا اکاؤنٹ تھا۔ خواجہ صاحب چیک پر اردو میں دستخط فرماتے تھے۔
لہٰذا اس دور کے مروجہ قواعد کے مطابق دیسی زبان میں دستخط کرنے والوں کو رقم نکلواتے
وقت بنک والوں کے روبرو دستخط کرنے پڑتے تھے۔ سوئے اتفاق سے وقوعہ کے
روز خواجہ صاحب نے اس بنک سے ایک ہزار روپیہ نکلوایا تھا اور مطبوعات کے لیے
کاغذ، طباعت وغیرہ کے سلسلے میں وہیں کھڑے کھڑے یہ رقم ایک کارکن کو دے
دی تھی۔ جن ہندو اہل کاروں نے یہ سب کچھ بچشم خود دیکھا، اُنھوں نے مرچ مصالحہ
لگا کر عوام میں یہ افسانہ مشہور کر دیا کہ خواجہ صاحب بھی سوامی جی کے قتل میں شریک
ہیں۔ اُنھوں نے یہ رقم فیس کے طور پر اس شخص کو دی تھی۔ بس پھر کیا تھا، ہندو
اخبارات نے خواجہ صاحب کے خلاف محاذ کھول دیا۔

ملتِ اسلامیہ جو غازی عبدالرشیدؒ کے جرأت مندانہ اقدام کی وجہ سے متحد
ہو کر غازی صاحب کی پشت پناہ بن گئی تھی، خواجہ صاحب کو ناحق پھنستا دیکھ کر
ہندو عزائم کے خلاف سیسہ پلائی دیوار بن گئی۔ خواجہ صاحب کے لاکھوں مُرید سر پر
کفن باندھ کر نکل آئے، لیکن ہندو ذہن نے خواجہ موصوف کو ملوث کرنے کا جو فسانہ
تراشا تھا، ابتدائی کارروائی ہی میں اس کی قلعی کھُل گئی۔ عدالت نے ان کو اس
معاملے میں بالکل غیر متعلق قرار دیتے ہوئے ان کے خلاف تفتیش روک دی۔ غازی

عبدالرشیدؒ نے ابتدائی کارروائی کے دوران ہی میں اعتراف جرم کر لیا تھا، اس لیے
ان کے خلاف مقدمہ چلا۔ دہلی، یو۔ پی اور پنجاب کے مسلمانوں نے مقدمے سے گہری
دلچسپی کا اظہار کیا۔ ہر پیشی پر عدالت میں عقیدت مندوں کا ہجوم امڈ آتا تھا۔ مقدمے کی
اہمیت کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ شروع سے آخر تک ساری رُوداد کی رپورٹنگ
مسلمانوں کی طرف سے مولانا محمد علی جوہر نے خود کی۔ فریق ثانی کی طرف سے بھی بلند پایہ
صحافی آتے تھے۔ رسمی کارروائی کے بعد بالآخر غازی عبدالرشیدؒ کو پھانسی دے دی گئی۔
قوم نے انہیں "شہید اور عاشق رسولؐ" کے خطاب سے نوازا۔ وہ قافلۂ عاشقان رسولؐ
کے سرخیل تھے۔ ان کے بعد غازی علم الدین شہیدؒ اور غازی عبدالقیوم شہیدؒ نے بھی
اسی طرح ناموس رسالتؐ کے تحفظ میں جانیں قربان کر کے ابدی زندگی حاصل کی۔

بنا کردند خوش رسمے بخاک و خون غلطیدن
خدا رحمت کند ایں عاشقانِ پاک طینت را

غازی عبدالرشید قاضی شہیدؒ

سرکارؐ تجھ سے خوش ہیں، اللہ تجھ سے راضی — عبدالرشید قاضیؒ
فردا ترا ہے روشن، ضو بار تیرا ماضی! — عبدالرشید قاضیؒ
ہے ذکر تیرا ہر جا، تو ہے شہید و غازی — عبدالرشید قاضیؒ
تو مر مٹا نبیؐ پر، تو لے گیا ہے بازی — عبدالرشید قاضیؒ
بالا ہے نُہ فلک سے تیرے قدم کی پستی — اے جانِ حق پرستی
تو رمز آشنائے ہر نیستی و ہستی — عبدالرشید قاضیؒ
تو الفت و وفا و اخلاص کی نشانی — ایثار کی کہانی،
اے دُرجِ حرفِ محرم! اے معدنِ معانی — عبدالرشید قاضیؒ
اک شردھانند لایا شدّھی کی جب برائی — ظلمت دلوں پہ چھائی
جرأت دکھائی تو نے، بُنیاد اس کی ڈھائی — عبدالرشید قاضیؒ
چھبّیس ۲۶ سن میں پھانسی دلّی میں کس نے پائی — اے نقشِ حق نمائی!
سبطِ نبیؐ نے کس کو یہ راہ تھی سُجھائی — عبدالرشید قاضیؒ
سر ہو گیا قلم پھر، فصلِ قلم جو بوئی — اے پیکرِ نکوئی!
ہے خوش نصیب تجھ سا بھی خوش نصیب کوئی؟ — عبدالرشید قاضیؒ
شیدا کر عوام تیرے، ہیں خواص بھی سلامی — محمودؔ سے بھی عامی
پائندہ فکر تیرا، ہے تیرا! عمل دوامی! — عبدالرشید قاضیؒ

راجا رشید محمود

اپنے نانا جان صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی حُرمت پر پیر کے دن شہید ہونے والے

غازی سیدؒ عبدالرشیدؒ

تحریر: سعدی سنگروری

شردھانند یقیناً واجب القتل تھا۔ وہ بڑھ بڑھ کر دینِ اسلام پر حملے اور پیغمبرِ اسلام کی شان میں گستاخیاں کرتا تھا۔ بزرگانِ دین کا مذاق اُڑانا اور مسلمانوں پر استہزاء کرنا اُس کا معمول بن گیا تھا۔ وہ نہایت متعصب اور متشدد آریہ سماجی لیڈر تھا۔ اگر وہ ایک مسلمان کے ہاتھوں قتل ہوا تو اُس سے پہلے دیانند سرسوتی جو آریہ سماج کا بانی تھا ایک برہمن کے ہاتھ سے مارا گیا۔ مگر اس پر ہندوؤں نے کبھی کوئی غل غپاڑہ نہیں کیا۔ لالہ رام چندر جموں والے کو ہندوؤں نے موت کے گھاٹ اُتارا۔ پنڈت تلسی رام آریہ سماجی لیڈر کو بھی ہندوؤں نے قتل کیا اور ایک اور آریہ سماجی لیڈر پنڈت لیکھ رام کو بھی کسی ہندو ہی نے قتل کیا جس کا پتہ نہیں چلا کہ اُس کا نام کیا تھا۔

غرض شردھانند کے سوا جسے ایک مسلمان مجاہد نے دینی غیرت اور ملّی حمیّت کے تقاضے سے مجبور ہو کر قتل کیا۔ باقی چار آریہ سماجی لیڈروں کو تو غیر مسلموں ہی نے قتل کیا مگر اُن کے قتل پر کوئی ہنگامہ آرائی نہیں ہوئی۔ اب پھر ایک مسلمان کے ہاتھوں شردھانند جو فتنہ و فساد کی جڑ تھا۔ اگر قتل ہو گیا تو یہ کوئی عظیم سانحہ نہ تھا۔

مسلمانوں کے خلاف شدھی اور سنگٹھن کی تحریک اصل میں سیاسی اور اقتصادی تحریک تھی۔ ہندوستان کے برہمن اور بنیے ہندوستان

کے بادشاہ بننا چاہتے تھے۔ لیکن اُن کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ ہندوستان کے مسلمان تھے جنہیں شُدھ کئے بغیر اس مسئلے کو حل نہیں کیا جا سکتا تھا چنانچہ یہی وہ مقصد تھا جس کے پیشِ نظر لالہ لاجپت رائے۔ مدن موہن مالوی اور کرم چند موہن داس گاندھی نے شردھانند کے قتل پر دس لاکھ روپیہ جمع کیا تاکہ نادار مسلمانوں کو روپے پیسے کا لالچ دے کر بآسانی ہندو بنا لیا جائے اور اس طرح سے رام راج قائم کرنے کا منصوبہ پایۂ تکمیل کو پہنچ جائے۔

ہندوؤں کے اس وقت جتنے بھی اخبارات تھے وہ سب کے سب شردھانند کے قتل کو بہت بڑا واقعہ قرار دیتے ہوئے اسلام اور مسلمانوں پر دن رات حملے کرتے اور یہ لکھتے چلے جاتے تھے کہ اسلام ایک خونخوار مذہب ہے اور مسلمانوں کا یہی مذہبی عقیدہ ہے کہ جہاں کہیں کافروں کو پاؤ وہیں قتل کر دو۔ سیدھے جنت میں جاؤ گے حالانکہ یہ الزام قطعی طور پر غلط ہے۔ اسلام کے نزدیک ایک غیر مسلم کی جان بھی اسی طرح محترم اور حفاظت کی مستحق ہے جس طرح ایک مسلمان کی جان! اسلام نے ہرگز یہ تعلیم نہیں دی کہ جہاں کہیں کافروں کو پاؤ قتل کر دو! مگر مذہبی تعصب اور نسلی جنون کا کیا کیجے۔ ہندو اخبارات اسلام کی اس واضح تعلیم کے باوجود کہ سکون و اطمینان اور امن و سلامتی ہی کا دوسرا نام اسلام ہے برابر یہی لکھتے رہے کہ مسلمان ایک جنگجو قوم اور اسلام ایک خونخوار مذہب ہے۔

یہ واقعہ ہے کہ ہندوستان پر کم و بیش ایک ہزار سال تک مسلمانوں کی حکومت رہی۔ اس طویل عرصے میں غیر مسلموں بالخصوص ہندوؤں سے جو فراخدلانہ رواداری کا سلوک کیا گیا۔ اُنہیں حکومت کے بڑے بڑے عہدے دیئے گئے۔ دنیا کی کسی اور قوم میں ایسی رواداری اور فراخدلی کی مثال نہیں ملتی۔ مگر اس کے باوجود ہندوؤں کے دلوں سے اسلام اور مسلمانوں کے خلاف کبھی بغض و عناد نہ گیا۔ اُنہوں نے جب

کبھی موقع پایا مسلمانوں پر وار کرنے میں کبھی دریغ نہ کیا۔ جب مسلمانوں کے حاکمانہ دور میں ہندوؤں کا یہ طرزِ عمل تھا تو پھر قیاس کیجئے کہ مسلمانوں کے محکومانہ دور میں اسلام اور مسلمانوں کے خلاف ہندوؤں کا طرزِ عمل کس قدر شدید اور سنگین ہوگا۔ غرضیکہ ہندوؤں کی آنکھوں پر جو تعصب کی پٹی بندھی تھی وہ بندھی رہی۔

جب ہندوستان کے مسلمان اپنی حکومت سے محروم ہو کر انگریزوں کے غلام ہوئے تو ہندوؤں کی فطرت کھل کر سامنے آگئی۔ ہندوؤں کے سخت متعصب ایک تجارتی ادارے برلا نے مسلمانوں کو ہندو بنانے کے لئے اپنے خزانے کا منہ کھول دیا۔ یہاں سے شدھی کا کام کرنے کا معاوضہ سوامی شردھانند کو ڈھائی ہزار۔ لالہ لاجپت رائے کو چھ ہزار اور مدن موہن مالوی کو پانچ ہزار روپے ماہانہ ملتا تھا۔ یہ لوگ بڑے عیّار اور مکّار تھے۔ ہندو مسلم بھائی بھائی کا نعرہ بلند کر کے خود تو پیچھے رہتے تاکہ مسلمانوں کو دھوکا دے سکیں آریہ سماجیوں کو آگے بڑھا دیتے تھے۔

——— انگریز حاکموں کو بھی اسلام اور مسلمانوں سے اسی طرح عداوت تھی جس طرح سے ہندوؤں کو، ورنہ کوئی وجہ نہیں کہ ہندو اخبارات کے خلاف غلط بیانی اور حد سے تجاوز کرنے پر قانونی کارروائی نہ ہوتی۔ جبکہ معاملہ ابھی پولیس کے ہی ہاتھوں میں تھا۔ عدالت تک نہیں پہنچا تھا۔ تفتیش ہو رہی تھی۔ مگر ہندو اخبارات نے تفتیش کا رُخ صحیح سمت سے موڑنے کے لئے ایسے بیانات شروع کر دئے جو تفتیش کو متاثر کر سکتے تھے اور وہ غیر قانونی فعل تھا۔ لہذا فیصلے کا جب موقع آیا تو وہ ہندوؤں کی توقعات کے عین مطابق ہوا۔ یعنی مسلمانوں پر قاتلانہ حملہ کرنے اور مفتی محبوب علی کو قتل کرنے والے ملزم بری ہو گئے اور تو اور خود گاندھی جی جس کا دعوے تھا کہ اُسے مسلمانوں سے محبت ہے اپنے اخبار ینگ انڈیا میں شردھانند کے قتل پر تو اپنے دلی رنج و غم کا اظہار

کرتا ہے مگر مفتی شہید کے خونِ ناحق پر افسوس کے طور پر ایک لفظ بھی نہیں کہتا۔

متعصب اخبار "پرکاش" دہلی نے اپنے اداریے ۲۹ر دسمبر ۱۹۲۶ء میں لکھا:

"سوامی شردھانند کے قتل میں ہم سازشیوں کو بھی ذمہ دار نہیں ٹھہراتے۔ خواہ اُن کی تعداد کتنی ہی کیوں نہ ہو۔ پھر ذمہ دار کون ہے؟ ذمہ دار وہ تعلیم ہے جو مسلمانوں کو اسلام دیتا ہے۔ وہ تعلیم کیا ہے؟ یہ کہ جہاں کافروں کو پاؤ قتل کر دو۔ کیونکہ کافروں کے قتل سے بہشت کے دروازے کھُل جاتے ہیں۔ آریہ سماج کا کام اس قسم کے افعال کو روکنے کا ہے۔ یہ کہ اسلام کی اس تعلیم کو نشٹ کیا جائے۔ وہ مسلمان لیڈر جو اس سانحۂ ہوشربا پر ہمدردی کا اظہار کر رہے ہیں۔ اگر اُن کی ہمدردی بناوٹی نہیں اور وہ چاہتے ہیں کہ اس قسم کے واقعات کا اعادہ پھر نہ ہو تو وہ اس پاک مقصد کے لئے ایک ہی کام کر سکتے ہیں وہ یہ ہے کہ اسلام کی تعلیم کو مٹانے کے لئے آریہ سماج کے ساتھ ہو جائیں"۔

اگرچہ پانچ لاکھ مسلمان تحریری طور پر مفتی مولوی محبوب علی کے قاتل کو کیفرِ کردار تک پہنچانے کی حکومت سے درخواست کر چکے تھے۔ تاہم حکومت کے اُس طرزِ عمل سے جو حکومت نے مسلمانوں کے خلاف روا رکھا تھا ایک معمولی سے معمولی آدمی بھی یہ بات بخوبی سمجھ سکتا تھا کہ مسلمانوں کی طرف سے حکومت کے ایوانوں میں دادخواہی کے لئے آواز بلند کرنا صدا بصحرا ثابت ہوگا۔ آخر کار وہی ہوا جس کا مسلمانوں کو خطرہ تھا یعنی مفتی محبوب علی کے قاتل کو رہا کر دیا گیا۔ سوامی شردھانند کے قاتل غازی سیّد عبدالرشید قاضی کو ۱۴ر نومبر ۱۹۲۷ء کو دوشنبہ صبح آٹھ بجے دہلی جیل میں پھانسی دے دی گئی۔ اور صبح ۹ بجے یعنی ایک گھنٹے تک لاش پھانسی کے تختے پر لٹکتی رہی۔

ہندوؤں کا بُغض و عناد اور کینہ پروری دیکھئے کہ غازی عبدالرشید کے پھانسی

پلنے پر بھی اُن کا دل ٹھنڈا نہ ہُوا۔ وہ گویا ایک قتل کا ساری قوم سے انتقام لینا چاہتے ہیں۔ ہر چند کہ مسلمانوں کے تمام بڑے بڑے رہنما معذرت کرتا نہ لہجے میں سوامی کے قتل پر افسوس کا اظہار کر رہے ہیں۔ مفتی کے قتل کو بھول چکے ہیں مگر ہندو ہیں کہ بڑھے چلے جا رہے ہیں۔ اُس وقت مسلمانوں کی بے بسی کا عالم کیا ہوگا؟ اس کا اندازہ اس واقعہ سے لگائیے کہ جب کسی ہندو نے آل انڈیا نیشنل کانگرس کے ہندو صدر کے نام اس مضمون کا خط لکھا کہ سوامی جی کے قتل کا کفّارہ کسی مسلمان کی جان لئے بغیر نہیں ہو سکتا تو مولانا محمد علی جوہر نے فوراً یہ اعلان کر دیا کہ اگر سوامی شردھانند کے قتل کے رنج سے ہندوؤں کی تسکین اسی صورت میں ہوگی کہ وہ کسی مسلمان کی جان لیں تو میری جان حاضر ہے۔

قاضی سیّد عبدالرشید یو۔پی کے ایک ضلع بلند شہر کے رہنے والے تھے۔ مگر عرصۂ دراز سے اُن کا خاندان دلّی چلا آیا اور یہیں ہمیشہ کے لئے سکونت اختیار کر لی۔ قاضی صاحب چھاپہ خانوں میں کتابت کرتے تھے اور وہاں سے پچاس ساٹھ روپے ماہانہ کما لیتے تھے۔

قاضی صاحب کا چہرہ کتابی۔ بدن دُبلا پتلا اور قد لمبا تھا۔ اُن کی عمر پچاس کے لگ بھگ تھی۔ وہ ہجرت کی تحریک میں افغانستان بھی گئے تھے اور وہاں مقیم بھی رہے۔ جب ہندوستان میں مسلمانوں کو مُرتد کرنے کی سوامی شردھانند نے تحریک شروع کی تو اُنہوں نے افغانستان ہی میں یہ ارادہ قائم کر لیا تھا کہ وہ سوامی شردھانند کو قتل کر دیں گے۔ تاکہ ہندوؤں اور مسلمانوں کی باہمی نااتفاقی دُور ہو اور مسلمانوں کا ایمان خراب کرنے والا ملک میں باقی نہ رہے۔

چنانچہ وہ افغانستان سے ہندوستان آئے۔ ۲۳ر دسمبر ۱۹۲۶ء شام کے بجے سوامی شردھانند کے مکان پر جا کر پستول سے چار گولیاں چلائیں اور سوامی کو

وہیں قتل کر دیا جس پستول سے انہوں نے سوامی شردھانند کو قتل کیا تھا۔ وہ پستول افغانستان سے لائے تھے۔ قاضی صاحب کو اسی موقع پر گرفتار کر لیا تھا۔

اُن پر جب عدالتِ عالیہ میں مقدمہ چلا تو گیارہ مہینے کے مقدمے کے بعد پریوی کونسل کے آخری فیصلے کے مطابق اُنہیں پھانسی دے دی گئی۔ وہ موت سے نہیں ڈرتے تھے۔ پھانسی کے تین گھنٹے پہلے اُنہیں خبر دی گئی کہ آج تمہارا آخری وقت آگیا ہے تو اُنہوں نے بغیر کسی گھبراہٹ کے دلیری سے کہا:

"خدا کا شکر ہے کہ میں نے یہ بات سُنی اور مجھے انتظار کے جیل خانے سے نجات ملی۔

وُضو کے لئے پانی لاؤ۔ تاکہ میں آخری نماز سے فارغ ہو جاؤں"۔ چنانچہ اُنہوں نے اِطمینان سے وضو کیا اور نماز پڑھی اور پھانسی کے تختے کی طرف جانے کے لئے اس طرح سے تیار ہو گئے۔ گویا وہ کسی دلچسپ سفر کے لئے آمادہ ہیں۔

دو شنبہ کا دن اتفاقی طور پر پھانسی کے لئے مقرر ہوتا ہے۔ مسلمانوں میں قاضی صاحب کے لئے یہ دن بہت ہی اچھا سمجھا جا رہا ہے۔ کیونکہ حضور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم دو شنبہ کو پیدا ہوئے اور دو شنبہ ہی کو وفات پائی۔ چونکہ قاضی صاحب اولادِ رسول تھے۔ اِس لئے اس دن کو اہمیت دی جاتی ہے۔

قاضی شہید کی قبر جیل خانہ دہلی کے مشرقی جنوبی گوشے میں مسلمانوں کے نئے قبرستان میں واقع ہے جس کے مشرق میں فیروز شاہ تغلق بادشاہ کا پُرانا قلعہ ہے۔ غازی شہید کی میت کا جیل کے دروازے پر ساٹھ ستر ہزار مسلمانوں نے خیر مقدم کیا۔ ڈھائی بجے قبرستان میں جنازے کی نماز ہوئی۔ حاکموں کے حکم کے مطابق ساڑھے تین بجے دفن کر دیا۔

شردھانند کے محب

اور غازی عبدالرشیدؒ کے کارنامے پر متأسف لیڈر

تحریر: راجا رشید محمود

خلافت کمیٹی نے "ہندو مسلم اتحاد" کے دام ہم رنگ زمین میں گرفتار ہو کر گاندھی جی کو "مہاتما" مانا‘ انہیں اور شردھانند کو مسجدوں کے منبروں کی زینت بنایا‘ مسلمان لیڈروں نے "بسم اللہ" کے بجائے "جے ہند" لکھنا شعار کر لیا۔ گاندھی جی مسلمان لیڈروں کی توہین کرتے رہے اور یہ اسے اوتار‘ امام عبداللہ" بن مبارک جیسے اور نبوت کے قابل گردانتے رہے۔

خلافت کمیٹی کے کرتا دھرتا گاندھی اور ہندوؤں کے دوسرے لیڈروں کے تابع مہمل بنے رہے مگر اس کے باوجود انہوں نے اسلام دشمنی اور مسلمان دشمنی ترک نہ کی۔ شدھی اور سنگھٹن جیسی گھٹیا تحریکیں چلائیں حتیٰ کہ حضور محسن انسانیت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی توہین کی راہ اختیار کی اور شہیدان ناموس رسالت کے ہاتھوں اس کا نتیجہ بھگتا۔

حقیقت یہ ہے کہ جب خلافت کمیٹی کے مسلمان لیڈر ہندو لیڈروں کو بے جا عزت دے رہے تھے‘ انہیں اپنا لیڈر مانتے تھے‘ ان کو خوش کرنے کے لیے اسلامی تعلیمات کو غلط معنی پہنا رہے تھے‘ اس وقت بھی ہندو مسلمانوں کے اور اسلام کے دشمن تھے اور جب مسلمان لیڈروں کو ہوش آ رہا تھا‘ اس وقت بھی وہ ہمارے دوست نہ تھے۔

گاندھی جی کو جامع مسجد خیر الدین امرتسر میں لے جایا گیا‘ انہوں نے محراب میں جا کر سجدہ کیا اور خادم مسجد کو گیارہ روپے بغرض خوراک غربا دیئے[1] انہیں اس مسجد میں منبر رسول (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) پر بٹھایا گیا اور یہ دعا کی گئی کہ اے اللہ! تو گاندھی کے ذریعے اسلام کی مدد فرما[2] گاندھی کو امام عبداللہ بن مبارک" جیسا کہا گیا[3] کہا گیا کہ "اگر نبوت ختم نہ ہو گئی

ہوتی تو مہاتما گاندھی نبی ہوتے" ۴ سورت میں تقریر کرتے ہوئے مولانا شوکت علی نے گاندھی کو امام مہدی کا مثیل قرار دیا ۵ مولانا ظفر علی خاں نے راولپنڈی میں تقریر کرتے ہوئے کہا "مہاتما گاندھی نے مسلمانوں پر جو احسان کیے ہیں' ان کا عوض ہم نہیں دے سکتے۔ ہمارے پاس زر نہیں ہے' جب جان چاہیں' ہم حاضر ہیں" ۔ ۶ مولانا ابوالکلام آزاد کی کوششوں سے مدرسہ اسلامیہ کلکتہ دسمبر ۱۹۲۰ء میں قائم ہوا جس کے صدر مدرس مولانا حسین احمد مدنی مقرر ہوئے ۔۔۔۔۔۔ رسم افتتاح مسٹر گاندھی نے ادا کی ۷ مولانا عبدالباری فرنگی محلی نے اپنے آپ کو گاندھی کا پس رو کہا' اسے اپنا رہنما تسلیم کیا ۸

گاندھی کے بارے میں خلافت کمیٹی کے رہنماؤں کا یہ رویہ خاص طور پر ۱۹۲۰ء میں سامنے آیا۔ انہی دنوں گاندھی جی نے اپنے اخبار "ینگ انڈیا" میں تحریک خلافت کے سربرآوردہ رہنماؤں کے بارے میں لکھا۔ "شوکت علی خلیق آدمی ضرور ہے لیکن ایک جوشیلا مذہبی پاگل ہے اور اس کی رائے کسی شخص کے لیے کوئی خاص وقعت نہیں رکھتی۔ حسرت موہانی نکما آدمی ہے جس پر ہروقت سودیشی کی دھن سوار رہتی ہے۔ ڈاکٹر (سیف الدین) کچلو ابھی کل کا بچہ ہے اور امرتسر سے باہر اسے کوئی تجربہ نہیں ہے" ۔ ۹ بعد میں گاندھی نے مولانا عبدالباری فرنگی محلی کے بارے میں اس رائے کا اظہار کیا۔ "وہ اکثر بلا سوچے سمجھے بات کرتے ہیں اور اپنے دوستوں کو مشکل میں ڈال دیتے ہیں" ۱۰

شدھی اور سنگھٹن کے زیر اثر کوہاٹ میں زبردست ہندو مسلم فسادات ہوئے تو گاندھی جی مسلمانوں کو قصوروار ٹھہراتے تھے۔ پھر انہوں نے اپنے اخبار "ینگ انڈیا" میں اس قسم کے مضامین لکھے اور ہندوؤں کو عورتوں کی عصمت کی قسمیں دلا دلا کر آمادۂ کارزار ہونے پر اکسایا ۱۱

شدھی کی غرض و غایت کے بارے میں سید نور احمد لکھتے ہیں۔ "ہندوؤں کے نزدیک مسلمانوں کا علاج شدھی تھا۔ شردھانند کا منصوبہ یہ تھا کہ ہندوستان کے تمام مسلمانوں کو جن کے باپ دادا ہندو تھے' شدھ کر کے دوبارہ ہندو بنا لیا جائے" ۱۲ مشہور کانگرسی ہندو لیڈر راج کمار ایس مٹھی نے کھلم کھلا اعلان کیا کہ بغیر شدھی کے "ہندو مسلم اتحاد" نہیں ہو سکتا۔ جس

وقت سب مسلمان شدھی ہو کر ہندو ہو جائیں گے تو اس ہندوستان میں سب ہندو ہی ہندو ہوں گے" ۔ ۱۳

موہن لعل بھٹناگر نے اپنے رسالہ "درپن" لاہور میں لکھا ۔۔۔۔۔۔ "ہندو یقین رکھیں کہ شدھی سے ہی گاؤ کشی رکے گی۔ یہی ان کے تمام دکھ دردوں کی دوا ہے۔ یہی ان کی مشکل کشا ہے" ۱۴ ہندوؤں کی اس متعصبانہ تحریک کے متعلق مولانا ظفر علی خاں نے ۱۹۲۷ء میں لکھا۔ "اسلام اور مسلمانوں کو ہندوستان کے نیست و نابود کرنے کے لیے یہ زہریلے سنگھٹیڈ جنہوں نے مذہب کو سیاست کا کھلونا بنا رکھا ہے' طرح طرح کے خوفناک منصوبے گانٹھ رہے ہیں" ۔ ۱۵

مسجدوں کو مندر بنانے کی آرزو میں پروفیسر رام دیو کہتا ہے۔ "ہندوستان کی ہر مسجد پر ویدک دھرم یا آریہ سماج کا جھنڈا بلند کیا جائے گا" ۱۶ سوامی ستیہ دیو کی زبان سے سنیے کہ رام راجیہ میں مسلمانوں کا کیا حال کرنا پیش نظر تھا۔ "قرآن کو الہامی کتاب نہیں سمجھنا چاہیے۔ حضرت محمد (صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم) کو رسول خدا نہ کہا جائے۔ سعدی و رومی کے بجائے کبیر و تلسی داس کی تصانیف کا مطالعہ کیا جائے۔ اسلامی تیوہاروں اور تعطیلوں کے بجائے ہندو تہوار اور تعطیلات منانی چاہییں۔ انہیں اسلامی نام بھی چھوڑ دینے چاہییں اور ان کی جگہ رام دین اور کرشن خان وغیرہ نام رکھنے چاہییں۔ ۱۷

پنڈت مدن موہن مالوی ہندو قوم کے سامنے مسلمانوں کے متعلق یہ کہتے ہیں۔ "میں یورپینوں اور مسلمانوں پر چماروں کو ترجیح دیتا ہوں" ۔ ۱۸ بھائی پرمانند "ہندو قومی تحریک" میں لکھتے ہیں۔ "تاریخ میں ہندو پرتھوی راج' شیواجی اور بیراجی کے ناموں کی عزت کرتے ہیں۔ جنہوں نے ہندوستان کی عزت اور آزادی کی خاطر مسلمانوں سے جنگ کی۔ درآنحالیکہ مسلمان محمد بن قاسم جیسے حملہ آور اور اورنگ زیب جیسے حکمران کو اپنا قومی ہیرو سمجھتے ہیں" ۱۹ مشہور ہندو لیڈر لالہ ہردیال "اسلامی حکومت" کے تصور سے خائف دکھائی دیتے ہیں' ملاحظہ ہو۔ "اگر ہندو اس فرض سے غافل رہے تو پھر ہندوستان میں اسلامی حکومت قائم ہو کر رہے گی" ۲۰

ہندوؤں کی مسلمانوں سے مخاصمت اور اسلام سے دشمنی کسی سطح پر بھی ڈھکی چھپی نہیں رہی۔ اس کے باوجود ہمارے مولویوں نے ان کے تابع مہمل ہونے میں جو تخصص پیدا کیا، وہ ہماری تاریخ کا تاریک باب ہے۔ "سوامی" شردھانند جس نے بعد میں شدھی تحریک کی بنا ڈالی اور حضور صلی اللہ علیہ و آلہ و سلم کی توہین کا مرتکب ہوا، اسے بھی خلافت کمیٹی والوں نے دہلی کی جامع مسجد میں منبر رسول (صلی اللہ علیہ و آلہ و سلم) پر بٹھایا اور ان سے تقریر کروائی ۲۱

شردھانند اسلام اور پیغمبر اسلام (صلی اللہ علیہ و آلہ و سلم) کے بارے میں نازیبا باتیں کرتا تھا۔ غازی سید عبدالرشید شہید" نے اسے اس جرم میں فنافی النار کر دیا تو جہاں مسلمانوں کی ہمدردیاں غازی" کے ساتھ تھیں، خلافت کمیٹی کے لیڈروں کے دل شردھانند کے ساتھ دھڑکتے تھے۔ مفتی محمد کفایت اللہ دہلوی نے شردھانند کے قاتل غازی عبدالرشید کے لیے فتویٰ دیا کہ وہ جنت سے محروم ہے۔ انہوں نے فرمایا۔ "کافر معاہد کا قاتل جنت کی بو بھی نہ سونگھے گا" ۲۲

۲۳ دسمبر ۱۹۲۶ء کو شردھانند واصل جہنم ہوا۔ اس کے دو ماہ بعد خلافت کمیٹی کے اجلاس منعقدہ ۲۶، ۲۷، ۲۸ فروری کی صدارت فرماتے ہوئے سیٹھ حاجی عبداللہ ہارون نے ہندوؤں اور ان کے لیڈر شردھانند (شدھی تحریک کے بانی) کے ساتھ اپنی محبت اور شاتم رسول ؐ کے قاتل غازی عبدالرشید" کے اقدام قتل پر اظہار تاسف یوں کیا۔ "سوامی شردھانند کے قتل کے واقعہ نے ہندو مسلمانوں کے درمیان نفرت اور ناانصافی کی خلیج کو اور بھی وسیع کر دیا ہے۔ جس طرح اس قتل کا ہونا بیان کیا ہے، وہ بہت ہی افسوس ناک ہے اور ہم مسلم پریس اور مسلم لیڈر اس واقعہ پر افسوس کر چکے ہیں اور مجھے بھی ہندو بھائیوں کے ساتھ ان کے اس صدمہ میں دلی ہمدردی ہے"۔ ۲۳

یہ شردھانند مسلمانوں کو زبردستی ہندو بنا رہا ہے۔ اس تحریک کا بانی ہے جو ہندوستان کے اہل اسلام کو شدھ کر کے ہندومت میں داخل کرنے کے لیے چلائی گئی ہے، اسلام اور اسلام کے بانی آقا حضور صلی اللہ علیہ و آلہ و سلم کی شان میں گستاخیاں کرتا ہے اور خلافت

کمیٹی کے "بڑے" غازی عبدالرشید" کے خلاف ہیں اور ہندوؤں سے معذرتیں کر رہے ہیں۔ حتیٰ کہ جب کسی ہندو نے آل انڈیا نیشنل کانگرس کے ہندو صدر کے نام اس مضمون کا خط لکھا کہ سوامی جی کے قتل کا کفارہ کسی مسلمان کی جان لیے بغیر نہیں ہو سکتا تو مولانا محمد علی جوہر نے فوراً یہ اعلان کر دیا کہ اگر سوامی شردھانند کے قتل کے رنج سے ہندوؤں کی تسکین اسی صورت میں ہو گی کہ وہ کسی مسلمان کی جان لیں تو میری جان حاضر ہے ۲۴

اسلام اور پیغمبر اسلام (صلی اللہ علیہ و آلہ و سلم) کے بارے میں خلافت کمیٹی کے رہنماؤں کے خیالات بس ایسے ہی تھے کیونکہ وہ ہندو دوستی یا بزعم خویش "ہندو مسلم اتحاد" کی لگن میں یوں لگے ہوئے تھے کہ مذہبی رواداری سے آخر کار مخلوط مذہب تک جا پہنچے۔ مرکزی خلافت کمیٹی کے آنریری سیکرٹری مولانا شوکت علی نے خلافت کمیٹی کے جلسہ منعقدہ الہ آباد (۲ جون ۱۹۲۰ء) کی رپورٹ میں یہ الفاظ تحریر کیے جو اخبارات میں شائع ہوئے۔ "الہ آباد میں ایک ایسا فیصلہ صادر کیا گیا ہے جو ان شاء اللہ تعالیٰ ایثار و رفاقت کی نئی اسپرٹ کو ترقی دے گا بلکہ ایک نئے مذہب کو جو ہندو مسلمانوں کا امتیاز موقوف کرتا ہے اور پریاگ یا سنگم کو ایک مقدس علامت بناتا ہے" ۲۵ جامعہ ملیہ دہلی میں ڈاکٹر سید محمود (وزیر تعلیم صوبہ بہار) نے فرمایا۔ "ہندو اور مسلمان ایک قوم ہیں جو ایک ہی وطن میں رہتی ہے۔ ان کو قومیت مٹا کر ایک مذہب بنا دینا چاہیے جو دونوں کا مشترکہ مذہب ہو" ۲۶ ڈاکٹر اشرف نے اخبار الجمعیۃ (جمعیۃ علماء ہند کا آرگن) میں تحریر فرمایا کہ "ہم ہندو مسلمان کے نئے تمدن میں مصروف ہیں۔ ہماری سیاسی اور سماجی کوشش یہی ہے کہ ہندو اور مسلمانوں کا ایک مذہب بنا دیا جائے" ۲۷

اس مضمون میں بعض تلخ حقائق اس لیے بیان کر دیئے گئے ہیں کہ تحفظ ناموس رسالت کی تاریخ مرتب ہو تو حضور صلی اللہ علیہ و آلہ و سلم کے گستاخوں کو اچھا سمجھنے اور ان کی متابعت اور فرمانبرداری کرنے والوں کا کردار بھی سامنے رہے۔ ریکارڈ درست رہے!!

حواشی

۱۔ اہلحدیث (ہفت روزہ) امرتسر۔ ۱۴ نومبر ۱۹۱۹ء صفحہ ۱۲

۲۔ مقالات یوم رضا حصہ اول۔ مرتبین: قاضی عبدالنبی کوکب و حکیم محمد موسیٰ امرتسری۔ صفحہ ۹۸، ۹۹ (مضمون "فاضل بریلوی کے رفقا کی سیاسی بصیرت" از حکیم محمد موسیٰ امرتسری)

۳۔ اہلحدیث (ہفت روزہ) امرتسر۔ ۱۴ نومبر ۱۹۱۹ء صفحہ ۱۲

۴۔ دبدبہ سکندری (روزنامہ) رام پور۔ یکم نومبر ۱۹۲۰، پیسہ اخبار (روزنامہ) لاہور۔ ۱۳ نومبر ۱۹۲۰

۵۔ پیسہ اخبار (روزنامہ) لاہور۔ ۱۲ نومبر ۱۹۲۰۔ ص ۲

۶۔ زمیندار (روزنامہ) لاہور۔ ۱۹۔ اگست ۱۹۲۰۔ ص ۲

۷۔ ابو سلمان شاہجہان پوری (مرتب) مکاتیب ابوالکلام۔ اردو اکیڈمی سندھ، کراچی۔ ص ۱۱۰

۸۔ خط مطبوعہ فیصلہ گاندھی شائع کردہ حسن نظامی۔ بحوالہ الطاری الداری لہفوات عبدالباری۔ مولفہ محمد مصطفیٰ رضا خاں قادری نوری۔ حصہ اوّل۔ جماعت رضائے مصطفیٰ بریلی۔ ۱۳۳۹ھ۔ ص ۴۰، ۴۱، ۴۲

۹۔ پیسہ اخبار (روزنامہ) لاہور۔ ۱۸۔ جولائی ۱۹۲۰۔ ص ۲

۱۰۔ علی گڑھ گزٹ۔ ۱۳ جون ۱۹۲۴ء (بحوالہ الطاری الداری۔ حصہ سوم ص ۱۳۱)

۱۱۔ عبدالوحید خاں۔ مسلمانوں کا ایثار اور آزادی کی جنگ۔ مکتبہ کارواں، لاہور۔ نومبر ۱۹۸۲۔ ص ۱۴۹

۱۲۔ سید نور احمد۔ مارشل لا سے مارشل لا تک۔ طبع دوم۔ فروری ۱۹۶۶۔ ص ۴۸

۱۳۔ عزیز جاوید۔ حاجی صاحب ترنگزئی۔ ادارہ تحقیق و تصنیف پاکستان، پشاور۔ بار سوم۔ اکتوبر ۱۹۸۲۔ ص ۳۵

۱۴۔ درپن (ماہواری رسالہ) لاہور۔ جون ۱۹۲۳۔ ص ۴۸۴

۱۵۔ زمیندار (روزنامہ) لاہور۔ ۲۶ جنوری ۱۹۲۷

۱۶۔ گورو گھنٹال (اخبار) ۱۰ جنوری ۱۹۲۷۔ بحوالہ صدائے حریت مرتبہ مشتاق حسین فاروقی۔ مطبع اہل سنت برقی پریس، مراد آباد۔ س ن

۱۷۔ وکیل (اخبار) امرتسر۔ ۹ دسمبر ۱۹۲۸

۱۸۔ پرتاب (روزنامہ) ۱۹ مارچ ۱۹۲۶

۱۹۔ ورڈکٹ آن انڈیا۔ ازبیورلی نکلس بحوالہ اقبال "قائداعظم" اور پاکستان از راجا رشید محمود۔ نذیر سنز پبلشرز، لاہور۔ ۱۹۸۳۔ ص ۱۱۷

۲۰۔ ملاپ (روزنامہ) لاہور۔ ۲۳ جون ۱۹۲۸۔

۲۱۔ احمد سعید، پروفیسر۔ حصول پاکستان۔ ایجوکیشنل ایمپوریم التصویر لاہور۔ اگست۔ ۱۹۷۶ء ص ۱۵۹، مارشل لا سے مارشل لا تک۔ ص ۴۸، عبدالوحید خاں
مسلمانوں کا ایثار اور آزادی کی جنگ۔ ص ۱۴۹

۲۲۔ ہمدم (روزنامہ) لکھنؤ۔ ۸ جنوری ۱۹۲۷، السواد الاعظم (ماہنامہ) مراد آباد رجب المرجب ۱۳۴۵ھ۔ ص ۱۷، تحریک آزادی ہند اور السواد الاعظم۔ از ڈاکٹر محمد مسعود احمد۔ رضا پبلی کیشنز، لاہور۔ فروری ۱۹۷۹۔ ص ۲۳۵

۲۳۔ خطبۂ صدارت جناب سیٹھ حاجی عبداللہ ہارون۔ ۲۶، ۲۷، ۲۸ فروری ۱۹۲۷ بمقام لکھنؤ قاضی محمد مجتبیٰ کوتانوی نے نیپئر روڈ کراچی سے شائع کیا۔ س ن۔ ص ۳۰، تحریک ہجرت ۱۹۲۰۔ از راجا رشید محمود۔ مکتبہ عالیہ، لاہور۔ ۱۹۸۶۔ ص ۵۳

۲۴۔ سعدی سنگروری، سید بشیر احمد۔ حیات کشفی اور تحریک یوم سیرت النبی، مکتبہ پاکستان، لاہور۔ جنوری ۱۹۸۹۔ ص ۲۳۵

۲۵۔ ہمدم (روزنامہ) لکھنؤ۔ ۸ جون ۱۹۲۰

۲۶۔ سعادت (پندرہ روزہ) کمالیہ ضلع لائلپور (اب فیصل آباد) یکم فروری ۱۹۴۲

۲۷۔ سعادت (ہفتہ وار) کمالیہ۔ ۲۲ جون ۱۹۴۲

========☆☆☆========

فیروز پور کا محافظِ ناموسِ رسالت

محمد صدیقؒ شہید

غیرتِ دینی کا مظہر، واقفِ رسمِ وفا
حفظِ تقدیسِ نبیؐ جس کا سدا شیوہ رہا
بابِ ناموسِ رسولِ ہاشمیؐ جس پر کھلا
قربِ حاصل جس کو محبوبِ خداؐ کا ہو گیا

نامِ نامی اس جری انسان کا صدیقؒ تھا

آ گیا فیروز پور سے پالامل کو مارنے
قتل کر ڈالا اُسے اس مردِ باکردار نے
آخر آخر منہ کی کھائی کفر کی یلغار نے
خواب میں یہ کام سونپا اس کو خود سرکارؐ نے

حکم کی تعمیل نے اس کا بڑھایا مرتبہ

عائشہ بی بی کے بیٹے کو ملی آخر نوید
نقشبندی سلسلے کا جو تھا اک فردِ فرید
پالامل کو مار کر، خود مر کے لی جنت خرید
ہو گیا ناموسِ سرکارِ دو عالمؐ پر شہید

خالقِ کونین کو اس کی پسند آئی ادا

راجا رشید محمود

پالامل سُنار کو کیفرِ کردار تک پہنچانے والے

غازی محمد صدیق شہیدؒ

تحریر: رائے محمد کمال

۱۵۔اگست ۱۹۸۵ء کی ایک اداس شام تھی۔ سورج دن بھر کی طویل مسافت کے بعد پربت کی فلک بوس پہاڑیوں سے ذرا پرے دھیرے دھیرے یوں لڑھک رہا تھا جیسے اجنبی گزرگاہوں کا کوئی مسافر نشیب کی سمت اُترتے ہوئے ٹھہر ٹھہر کر اپنا قدم اٹھائے۔ میرے اردگرد رات اپنے سیاہ دراز گیسو کھولے کھڑی تھی۔ میں چونک اُٹھا، ایسا نہ ہو کہ اندھیاروں کی زہریلی ناگن میرے فکر کو ڈس لے۔ وقت کی دہلیز پر بیٹھے میں اس سوچ میں مستغرق ہو گیا کہ جانے شہرِ خموشاں کے کتنے زائرین قریب قریب سے چپ چاپ گزر جاتے ہیں اور نہیں جانتے کہ ملّتِ شاہِ حجازؐ کے ایک گمنام محترم غیور جانباز کے گوشۂ راحت کی زیارت سے محروم رہ گئے ہیں۔ قصور کی شہری آبادی سے ملحقہ لنک کچہری روڈ پر ایک بڑا قبرستان واقع ہے۔ یہاں آفیسرز کالونی کے عین مقابل سڑک سے بائیں جانب ایک احاطے میں حضرت غلام محی الدین صاحب کا مقبرہ دکھائی دیتا ہے۔ ذرا دور ایک نومسلم بزرگ کا مزار مگر اس کے بالکل نزدیک بظاہر خستہ حال یہ کسی لاوارث کی تربت ہے متصل شارعِ عام سے ہزاروں لوگ گاڑیاں دوڑاتے ہوئے بے خبری میں آگے نکل جاتے ہیں انہیں کون بتلائے کہ دو چار قدم ہٹ کر غیرت و فقر کا ایک زندہ مرقع درسِ محبت دے رہا ہے۔ مرقد کی چاروں طرف چھوٹی چھوٹی دیوار جس کی اینٹیں اکھڑ چکی ہیں، تعویذ پر گلاب کے تازہ پھولوں کی چادر بچھی ہوئی۔ شکستہ لوحِ مزار پر تاریخِ وصال اور کلمہ طیبہ کے علاوہ مندرجہ ذیل قطعہ رقم ہے:

"صدیق چوں شہیدِ رہِ لا الٰہ شد
مسند نشین عشق بصد عزّ و جاہ شُد
آمد ندا ز غیب کہ آں مردِ سر فروش
خاکِ رہِ جنابِ رسالت پناہ شُد"

میں مقبرے کی دائیں سمت بیٹھا گزرے دنوں کے شب و روز کا جائزہ لے رہا تھا۔ دیکھتے ہی دیکھتے اس خطۂ ارض پر اقدس و اکمل، اطیب و اطہر، نورِ مجسم حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں ہرزہ سرائیوں کا طویل سلسلہ شروع ہو جاتا ہے۔ پورے ہندوستان میں حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سیرتِ پاک کا تقدس لہو لہو تھا۔ کتّے مسلسل بھونک رہے تھے۔ چیلیں اپنی ناپاک چونچوں میں توہین و تضحیک کے کنکر اٹھائے گھونسلوں سے باہر نکل آئی تھیں۔ دیارِ فرنگ سے بلادِ ہند پر متعصب پادریوں کی یلغار، آریہ سماجیوں کا باطل پروری کا مظاہرہ اور مرزا غلام احمد قادیانی کا انگریزوں کی آغوش میں دعوٰی نبوت ——— ہر طرف ایک طوفانِ بدتمیزی بپا ہے۔ دہن دراز گستاخ اپنے زہر میں بجھے ہوئے تیروں کا رُخ مدینہ منورہ کی طرف موڑ لیتے ہیں۔ حضرت عائشہؓ کے حجرے کی مقدس دیواریں لرز اُٹھیں۔ بے چارگی کے ان حالات میں میرے آقا و مولا (علیہ التحیۃ والثناء) کی حرمت کے سربکف محافظ آگے بڑھتے ہیں۔ یہ خوبرو نوجوانوں کا مختصر گروہ تھا۔ آنکھوں میں بجلیاں، ہونٹوں پر مسکراہٹ کی چاندنی اور زبان پر ہم حاضر ہیں "یا رسول اللہ" کا رقت انگیز ترانہ لیے رسمِ دار نبھانے کو آگے بڑھتے چلے جا رہے ہیں۔ اُنھوں نے محبوب نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے علوِ مراتب، عمدہ کمالات، ارفع درجات اور اعلیٰ مقامات پر حرف گیری کرنے والے بدطینت گستاخوں اور رذیل بے ادبوں کی غلیظ زبانیں نوچ کر کتوں کے آگے پھینک ڈالی تھیں۔

عشق و محبت کے انہی بندوں میں سے شمعِ رسالتؐ کے ایک پروانے کا نام غازی محمد صدیق شہیدؒ ہے۔ جو صداقت کا پرچم تھام کر اٹھا اپنے لہو سے کتابِ صدق رقم

کی۔ رسمِ صدیقی ادا کرتے ہوئے مردودِ ازلی کو جہنم رسید کیا اور صدیق اکبرؓ کی قربت سے مسند نشین ہو گیا۔ جھوٹے مدعیانِ نبوت کو ٹھکانے لگانے کا تذکرہ ہو تو حضرت ابوبکر صدیقؓ اور اگر تاجدارِ مدینہ کی ذات والاصفات پر طنز و تضحیک کے تیر برسانے والوں کو کیفرِ کردار تک پہنچانے کا ذکر آئے تو قصور کے غیور مسلم نوجوان محمد صدیقؒ کی یاد تڑپانے لگتی ہے۔ اس صدی کے ربع اوّل میں ہندومت کے احیاء کی تحریک زوروں پر تھی۔ متعصب ہندوؤں نے برصغیر پاک و ہند میں مسلم کشی کی ایک گہری سازش تیار کی۔ ایسی ہی دو انتہا پسند تنظیمیں آریہ سماج اور سنگھٹن تھیں۔ اوّل الذکر کے مقاصد میں مسلمانوں کو ان کے تہذیبی ورثے سے کاٹ دینا تھا۔ ثانی الذکر ایک عسکری انجمن تھی اور طاقت کے بل بوتے پر ملتِ اسلامیہ کو مٹا دینا اس کا مطمحِ نظر تھا۔

آریہ سماجی تنظیم کا بانی سوامی دیانند سرسوتی تھا۔ اس نے "ستیارتھ پرکاش" کے نام سے ایک گمراہ کن کتاب لکھی۔ کتاب کا چودھواں باب اسلام دشمنی پر مبنی تھا۔ سوامی مذکور کے تنگ نظر چیلے پورے ہندوستان میں پھیل گئے اور یوں تحریک شماتتِ رسولؐ شروع ہو گئی۔ دہلی میں حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ایک گستاخ ہندو سوامی شردھانند، قاضی عبدالرشیدؒ کے ہاتھوں واصلِ جہنم ہوا۔ لاہور میں راجپال کو غازی علم الدین شہیدؒ نے تہِ تیغ کیا۔ پشاور کے دو مسلم نوجوانوں، تلہ گنگ کے غازی محمد شہیدؒ، چکوال کے غازی مرید حسین شہیدؒ اور غازی محمد منیر شہیدؒ کا تذکرہ اس کے علاوہ ہے۔ تاہم ان صفحات میں بدزبان ہندو سنار پالامل کو انجام تک پہنچانے والے شیر دل مجاہد غازی محمد صدیق شہیدؒ کے حالات و واقعات کو ضبطِ تحریر میں لایا جا رہا ہے۔

غازی محمد صدیق شہید کا نسبی تعلق شیخ برادری سے تھا۔ شمعِ نبوت کے اس شیدائی کی ولادت باسعادت ۱۹۱۴ء کے درمیانی مہینوں میں ہوئی۔ پانچ سال کا ہو جانے پر انہیں مسجد میں بٹھایا گیا۔ ۱۹۲۵ء تک دینی تعلیم کے علاوہ آپ پانچویں جماعت

بھی پاس کر چکے تھے۔ چونکہ آپ کے والدِ ماجد شیخ کرم الٰہی فیروز پور چھاؤنی میں جو
قصور سے قریباً پندرہ میل کے فاصلے پر ہے، پکے چمڑے کا آبائی پیشہ اختیار کیے
ہوئے تھے، وہ اپنے اہل و عیال کو بھی ساتھ لے گئے۔ غازی صاحب کو چھاؤنی
کے قریب ہی ایک تعلیمی ادارے میں داخل کرایا گیا جہاں آپ تین سال تک
زیرِ تعلیم رہے اور آٹھویں کا امتحان پاس کیا۔ اسی دوران آپ کے والدِ گرامی چند روز
کی ناسازئ طبیعت کے بعد جہانِ فانی سے کوچ فرما گئے۔ غازی محمد صدیق شہیدؒ کی
والدہ محترمہ کا نام عائشہ بی بی تھا۔ آپ بڑی نیک سیرت اور حوصلہ مند خاتون تھیں،
ان کی تربیت کا اثر موصوف کے تاریخی عمل سے ۱۹۳۵ء میں سامنے آیا جب شمعِ رسالت
کے یہ پروانے تختۂ دار کو رونق بخش گئے۔ حضرت غازی علیہ الرحمہ تعلیم کا سلسلہ جاری
نہ رکھ سکے تھے لیکن دینی کاموں میں بڑھ چڑھ کر حصّہ لینے لگے۔ محافلِ میلاد منعقد کروانا
تو گویا اک معمول تھا۔ نعتِ رسولِ مقبول (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) خوش الحانی سے
پڑھتے، کوئی اور دلسوزی سے پڑھتا تو سر دُھنتے تھے۔ آقا حضور حبیبِ کبریا صلی اللہ علیہ
وآلہ وسلم کے نامِ نامی سے ان کی محبت و وارفتگی کی صحیح کیفیت کا بیان تو کسی
صورت بھی الفاظ میں ممکن نہیں۔ ذاتِ اقدس سے ان کی محبت و الفت والہانہ تھی۔
لباس ہمیشہ سنت کے مطابق رکھتے۔

ایک روایت ہے کہ آپ نے کئی بار حضرت داتا گنج بخش اور حضرت بابا بلھے شاہ
(رحمہم اللہ تعالیٰ) کی درگاہوں پر حاضری دی۔ نماز تو کبھی قضا نہ ہونے دی۔ روزے
کے بھی سختی سے پابند تھے۔ غازی ممدوحؒ کے برادرِ اصغر، شیخ محمد شفیع طاہر صاحب
نے اپنی یادداشتوں میں لکھا ہے "چھوٹی عمر ہی میں آپ نے حضرت شیخ محمد صاحب
نقشبندی محلہ پیرانوالہ نزد دہلی دروازہ (فیروز پور)" کے دستِ حق پرست پر
بیعت کر لی تھی اور حفظِ قرآن کے لیے بھی کوشاں رہنے لگے۔" سوامی شردھانند
ملعون اور مہاشہ راجپال مردود کے واصلِ جہنم ہو جانے کے بعد منافقانِ ازلی کے
مسلکی اور مشربی بھائی بھی کہیں کہیں سر اٹھاتے رہے اور انھوں نے عظمت و عصمتِ رسول

(صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو استہزا کا نشانہ بنایا۔

ایسے ہی ایک زبان دراز، کج رو، کور ذوق، کمینہ فطرت، ملیچھ اور ناپاک ہندو
نے "پالا مل" تھا۔ زرگری اس کا ذریعہ معاش تھی۔ حقیقت یہ ہے کہ مسمی پالا مل ایک
صاحبِ ثروت ہندو سنار تھا۔ اس کی دکان حضرت درگاہ حضرت بلھے شاہ رحمۃ اللہ علیہ
سے ذرا دور تھی۔ اس کی پشت پر ہندو ساہوکاروں کا ہاتھ تھا۔ بنیوں کے ٹولے کی
حمایت میں ابتداءً وہ مسلمانوں کی معاشی ناسازگاریوں پر بکواس کرتا رہا۔ اس نے کئی بار
برملا کہا قرضہ تو یہ واپس دیتے نہیں اور بنے پھرتے ہیں "مسلمان"۔ ایک مرتبہ
اس نے کہا "مسلمانوں کا خدا اپنے بندوں سے زکوٰۃ کی بھیک مانگتا ہے جبکہ ان
بیچاروں کو دو وقت کی روٹی بھی کھانے کو نہیں ملتی"۔ مسلمانوں کو چپ سادھے دیکھ کر
اس کا حوصلہ روز بروز بڑھتا گیا اور اولیائے عظام (رحمہم اللہ) کے متعلق گالیاں
بکنا اس کا معمول بننے لگا۔ ہندوؤں کو اکٹھا کر کے نماز کی نقلیں اتارنا اور اپنی عجیب و
غریب حرکات سے انہیں ہنساتے رہنا تو گویا اس کا ہر روز کا مشغلہ تھا۔ بات
فحش کلامی سے بہت آگے جا چکی تھی۔

روزنامہ "انقلاب" لاہور کی، ۲ دسمبر ۱۹۳۴ء کی اشاعت کے مطابق مسمی
پالا مل نے بے ادبیوں کا یہ کھلم کھلا سلسلہ شروع کر رکھا تھا۔ ۱۶ مارچ کو جب لوگ
نماز پڑھ رہے تھے، مردود مذکور نے نہ صرف نماز کا مضحکہ اڑایا بلکہ سرکارِ مدینہ
(صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی ذاتِ اقدس کے متعلق نازیبا کلمات بکے۔ شانِ رسالت
مآب (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) میں صریحاً گستاخی کی۔ اس قبیح حرکت پر پورے شہر
میں غم و غصہ کی لہر دوڑ گئی۔ مسلم معززین کے مشورے پر محمد کلیم، پیر صاحب نے عدالت
میں استغاثہ دائر کر دیا۔ مسٹر ٹیل مجسٹریٹ درجہ اوّل لاہور نے بڑی تندہی سے اس
مقدمے کی موشگافیوں کو پیشِ نگاہ رکھا بالآخر فریقین کے دلائل سننے کے بعد
مجسٹریٹ مذکور نے اپنے فیصلے میں لکھا "میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ ملزم نے واقعی
توہینِ رسالت مآب (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی ہے جس سے مسلمانوں کے جذبات

مشتعل ہوئے اور سخت فساد کا خطرہ پیدا ہو گیا۔ اس لیے پالا مل کو چھ ماہ قید اور دو سو روپے سزا دی جا رہی ہے۔"

۲۰ ستمبر ۱۹۳۴ء کے روزنامہ "سیاست" لاہور میں اس کی تفصیل یوں درج ہے: پالا مل شاہ سُنار کے خلاف توہینِ پیغمبرِ اسلام (صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم) کے الزام میں مقدمہ چلتا رہا۔ ملزم نے مجسٹریٹ کے فیصلے کے خلاف مسٹر بھنڈاری سیشن جج لاہور کی عدالت میں اپیل دائر کی۔ یہاں سے اُسے تا فیصلہ ضمانت پر رہا کر دیا گیا۔ ان دنوں فیروز پور روڈ سے گزرنے والوں نے سنا کہ لاہور، چونگی کے نزدیک واقع مشہور گورستانی میانی صاحب سے غم ناک چیخیں بلند ہو رہی ہیں۔ درد کی شدت اور آواز کا کرب مسلسل بڑھتا ہی چلا گیا۔ دل ہلا دینے والی یہ آہیں "غازی علم الدین شہیدؒ" کے مقبرے سے اُٹھ رہی تھیں۔ معلوم ہوتا جیسے آپ کہہ رہے ہوں کہ میں قبر میں تڑپ رہا ہوں۔ کون ہے جو میرے لیے کہیں سے سامانِ تسکین ڈھونڈ لائے۔ راجپال کا ہم ذوق قصور کی شاہراہوں پر دندناتا پھر رہا ہے، کیا میرے چاہنے والے مر گئے ہیں؟ اگر میرا کوئی جواں سال وارث زندہ ہے تو خدا کے لیے تختۂ دار پر بزمِ رقص سجا کر مجھ سے ہم آغوش ہو جائے۔ وہ دیکھو سامنے آقا و مولا (صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم) کوہِ اضم کی چوٹیوں پر استقبال کے لیے تشریف فرما ہیں۔ ہے کوئی شہیدِ رسالت جو آپ کے کھلے ہوئے بازوؤں میں سمٹ جائے"۔

انہی دنوں کا ذکر ہے، ایک رات حافظ غازی محمد صدیق صاحب نیند میں تھے کہ مقدر جاگ اُٹھا۔ نصف شب بیت چلی تھی جب آپ کو سرورِ بنی آدم، روحِ روانِ عالم، دلیلِ کعبۂ مقصود، کاشفِ سرِ مکنون، خازنِ علمِ مخزون جناب احمدِ مجتبیٰ حضرت محمد مصطفیٰ (صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم) کی زیارت نصیب ہوئی۔ سرکار صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے فرمایا قصور میں ایک بدنصیب ہندو پے در پے ہماری شان میں گستاخیاں کرتا چلا جا رہا ہے، جاؤ، اور اس کی ناپاک زبان کو لگام دو۔ قبلۂ صدق و صفا، کعبۂ اربابِ حلم و حیا، وارثِ علومِ اولین، مورثِ کمالاتِ آخرین، مدلولِ حروفِ مقطعات، شہنشاہِ فضائل و

کمالات رحمۃ للعالمین خاتم النبیین (صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم) کی حرمت و عزت کا یہ جانباز محافظ کئی روز تک شدتِ غم و غصہ میں پیچ و تاب کھاتا رہا تھا۔ ان کے سینے میں جوشِ غضب کی چنگاریاں چٹخ رہی تھیں۔ ان کے دل میں ایک ہی جذبہ موجزن تھا کہ وہ جلد از جلد قصور پہنچ کر اپنے آقا و مولا (صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم) کے دشمن کو جہنم رسید کریں۔

۱۰ ستمبر ۱۹۳۴ء کی بات ہے، انھوں نے والدہ ماجدہ سے عرض کی کہ "مجھے خواب میں ایک دریدہ دہن کافر دکھلا کر بتایا گیا ہے کہ یہ ناہنجار توہینِ نبوی (صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم) کا مرتکب ہو رہا ہے، اسے گستاخی کا مزہ چکھاؤ تاکہ آئندہ کوئی شاتم اس امر کی جرأت نہ کر سکے۔ میں قصور اپنے ماموں کے پاس جا رہا ہوں۔ گستاخ موذی وہیں کا رہنے والا ہے۔ مجھے بتایا گیا ہے کہ اس ذلیل کُتّے کی ذلت ناک موت میرے ہی ہاتھوں واقع ہو گی۔ نیز مجھے تختۂ دار پر جامِ شہادت پلایا جائے گا۔ آپ دعا فرمائیں کہ بارگاہِ سرکار صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم میں میری قربانی منظور ہو اور میں اپنے اس عظیم فرض کو بطریقِ احسن نبھا سکوں"۔ ماں نے بخوشی اجازت دے دی۔ ایک مؤمنہ کے لیے اس سے بڑھ کر کیا مسرت ہو سکتی ہے کہ اس کا بیٹا دینِ اسلام کے کام آئے۔

۱۷ ستمبر ۱۹۳۴ کی شام کا واقعہ ہے حضرت قبلہ غازی صاحبؒ دربار بابا بلھے شاہؒ کے نزدیک نیم کے درخت سے ٹیک لگائے کھڑے تھے۔ عقابی نگاہیں آنے جانے والوں کا بغور جائزہ لے رہی تھیں۔ اتنے میں ایک ایسا شخص دکھائی دیا جس نے چہرے پر کسی حد تک نقاب اوڑھ رکھا تھا۔ آپ نے جھٹ اس کی راہ روکی اور پوچھا تو کون ہے اور کہاں سے آیا ہے؟ یہاں کیا کرتا ہے؟ اُسے اپنا نام بتانے میں تامل تھا۔ نوبت ہاتھا پائی تک پہنچی۔ آپ کو تنہا دیکھ کر اسے بھی حوصلہ ہوا، وہ کہنے لگا، مسلمانوں نے پہلے میرا کیا بگاڑ لیا ہے اور اب کون سی قیامت آجائے گی۔ الغرض غازی موصوف نے اسے پہچان لیا کہ یہی وہ گستاخِ رسول ﷺ ہے جسے ٹھکانے لگانے پر انہیں مامور کیا گیا ہے۔ غازی نے فرمایا میں تاجدارِ مدینہ (صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم)

کا غلام ہوں، کئی دنوں سے تیری تلاش میں تھا۔ اے دہن دراز ملیچھ! آج تو کسی طرح بھی ذلت ناک موت سے نہیں بچ سکتا۔ یہ کہہ کر آپ نے تہ بند سے رمپی (چمڑہ کاٹنے کا اوزار) نکالی اور للکارتے ہوئے اس پر حملہ آور ہو گئے۔ حافظ محمد صدیق متواتر وار کیے جا رہے تھے۔ وہ زور زور سے نعرۂ تکبیر لگا کر بے غیرت پر برس پڑتے۔ واقعات کے مطابق پورے ساڑھے سات بجے بارگاہِ رسالت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) میں گستاخی کرنے والا یہ خبیث شخص جسے لوگ لالہ پالا مل شاہ کے نام سے جانتے تھے، اپنے منطقی انجام تک پہنچ گیا۔

مقتول مردود کے واویلا اور آپ کے نعرہ ہائے تکبیر سے کثیر تعداد میں لوگ اس جانب متوجہ ہو چکے تھے۔ عینی شاہدوں کا کہنا ہے کہ "غازی اُس وقت تک ملعون ساہوکار کی چھاتی سے نہیں اُترے جب تک موت کا پختہ یقین نہیں ہو گیا۔ غازی کا لباس ناپاک خون کے چھینٹوں سے آلودہ ہو چکا تھا اردگرد بھی گندے لہو کے داغ ہی داغ تھے۔ مقتول کا چہرہ نہ صرف بُری طرح مسخ ہوا بلکہ ہیبت ناک شکل اختیار کر گیا تھا یہاں تک کہ ڈر کے مارے کوئی قریب نہ پھٹکتا تھا۔ میڈیکل رپورٹ کے مطابق اس کے جسم پر چالیس زخموں کے واضح نشان تھے۔ موقع پر موجود افراد کا بیان ہے کہ اگر غازی صاحب فرار ہونا چاہتے تو بآسانی ایسا کر سکتے تھے مگر اُنہوں نے اپنے کام سے فارغ ہو چکنے کے بعد دوگانہ نمازِ شکرانہ ادا کی اور قریبی مسجد کی سیڑھیوں پر اطمینان کے ساتھ بیٹھ گئے اور وقفے وقفے سے زیرِ لب مسکراتے اور گنگناتے رہے۔ اس وقت تمام ہندوؤں کے چہرے اُترے تھے مگر غازی صاحبؒ نہایت مطمئن اور سرشار نظر آئے۔ دیکھنے والوں نے دیکھا کہ آپ کی یہ ادا مسلمانوں کی سربلندی اور غیرت مند فطرت کا منہ بولتا ثبوت تھی۔

۱۱ر اکتوبر ۱۹۳۴ء کو یہ مرافعہ چودھری غلام مصطفیٰ ڈویژنل مجسٹریٹ کی عدالت میں پیش ہوا۔ جب غازی محمد صدیقؒ سے پوچھا گیا کہ آپ کچھ کہنا چاہتے ہیں تو اُنہوں نے فرمایا "چونکہ مقتول نے رسولِ اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی شان میں سخت

بے ادبی کی تھی اس لیے میں نے اسے جہنم واصل کر دیا۔ میرا یہی بیان ہے۔" سیشن کورٹ میں آپ کے مقدمہ کی سماعت ۴ر دسمبر ۱۹۳۴ء سنٹرل جیل لاہور میں مسٹر سیل سیشن جج کے روبرو شروع ہوئی۔ غازی صاحبؒ کی طرف سے میاں عبدالعزیز صاحب بیرسٹر اور شیخ خالد لطیف گابا (نومسلم کے ایل گابا "پیغمبرِ صحرا" کے مصنف) پیروکار تھے۔

غازی صاحبؒ نے اپنے بیان میں فرمایا "بلاشبہ پالا مل کو میں نے قتل کیا ہے کیونکہ اس ملعون نے رسول کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی توہین کی تھی۔ وہ دیدہ دانستہ اس جرم کا مرتکب ہوا۔ اسے راجپال اور غازی علم الدین شہیدؒ کے واقعہ کا بھی بخوبی علم تھا۔ اس نے سب کچھ جانتے بوجھتے ہوئے خود کو سزا کے لیے پیش کیا اگر اس واقعہ (شانِ رسالت میں گستاخی) کو بیس سال بھی گزر جاتے تب بھی میں اُسے ضرور بالضرور واصلِ جہنم کر کے چھوڑتا۔ ہمارے مذہب کے مطابق وہ ہرگز ہرگز مسلمان نہیں بلکہ کوئی منافق ہے جو نبی پاک (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی توہین سن کر خاموش رہے اور عصمت و ناموسِ رسول (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) پر جان قربان نہ کرے۔ کسی اور شخص کی ذات کا مسئلہ ہو تو برداشت ہو سکتا ہے۔ دنیوی اُمور میں کسی بھی فرد کی شان میں گستاخی پر چپ رہا جا سکتا ہے لیکن سرکارِ مدینہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے مقام و مرتبہ کے بارے میں ہرزہ سرائی کرنے والوں کے خلاف غیظ و غضب، جوش و ولولہ اور غصہ کسی حالت میں بھی کم نہیں ہو سکتا۔ میں نے جو کچھ کیا خوب غور و فکر کے بعد غیرتِ دینی کے سبب اپنے رسول (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی شان کو برقرار رکھنے کے لیے کیا ہے۔ اس پر مجھے قطعاً تاسف یا ندامت نہیں بلکہ میں اپنے اِس اقدام پر بہت خوش اور نازاں ہوں۔ عدالت مجھے زیادہ سے زیادہ جو سزا دے سکتی ہے جب چاہے دے دے مجھے قطعاً حُزن و ملال نہ ہو گا مگر جب تک ہمیں شہنشاہِ مدینہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی حُرمت و تقدس کے تحفظ کی ضمانت فراہم نہیں کی جاتی، کوئی نہ کوئی سرفروش بزمِ دار و رسن میں محبت کے چراغ

جلاتا ہی رہے گا۔ یہ تو ایک ہے، اس کی بات ہی کیا؟ میں تو آپؐ کی خاکِ قدم پر پوری کائنات بھی نچھاور کر ڈالوں تو میرا عقیدہ، میرا ایمان اور عشق و وجدان کہتا ہے کہ گویا پھر بھی حقِ غلامی ادا نہیں ہو سکا۔

سیشن کورٹ میں فیصلے کے دن حضرت قبلہ حافظ غازی صاحب علیہ الرحمہ کی والدہ نے اپنے جوان سال بیٹے کی پیشانی کو چومتے ہوئے نہایت حوصلے کے ساتھ فرمایا "میں خوش ہوں جس رسول (صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم) کی شان و عظمت کے تحفظ کے لیے تم قربان گاہ پر جا رہے ہو، اس محبوبِ کردگار صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی شان قائم رکھنے کے لیے مجھے تم جیسے بیس۲۰ بیٹوں کی قربانی بھی دینا پڑے تو ربِ کعبہ کی قسم! کبھی دریغ نہ کروں۔" روزنامہ انقلاب لاہور اور دیگر معاصر مسلم اخبارات میں غازیؒ کی والدہ کے اس جرأت مندانہ بیان کے علاوہ غازی موصوفؒ کے بارے میں یہ بھی درج ہے کہ آپ نے ان ایمان پرور الفاظ کو سنتے ہی زور سے نعرۂ تکبیر بلند کیا اور والدہ موصوفہ سے اپنے گناہوں اور غلطیوں کی معافی مانگتے ہوئے کہا: میں نے پالا مل کو قتل کر کے اپنے نبی (صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم) کی شان قائم رکھنے کے لیے جو قربانی پیش کی ہے، اس کی خاطر اگر مجھے ہزار مرتبہ جینا یا مرنا پڑے تو تب بھی میں ہر دفعہ ناموسِ رسالتؐ پر پروانہ وار فدا ہوتا رہوں گا اور اسے صدقِ دل سے اپنا فرضِ عین سمجھتا ہوں۔

سیشن کورٹ میں غازی محمد صدیقؒ کے لیے سزائے موت کا حکم سنایا گیا۔ زندہ دلانِ قصور نے اس فیصلہ کے خلاف ہائی کورٹ لاہور میں اپیل گزاری۔ عدالتِ عالیہ میں ۳۱، جنوری ۱۹۳۵ء کو سماعت ہوئی۔ فیصلہ صادر کرنے کے لیے ایک ڈویژنل بینچ تشکیل دیا گیا اس میں چیف جسٹس اور جسٹس عبدالرشید شامل تھے۔ فیصلے کے طور پر سیشن کورٹ کا حکم بحال ہوا۔ غازی محمد صدیقؒ کو ابتداءً سب جیل قصور ہی میں محبوس رکھا گیا۔ جب مقدمہ سیشن کے سپرد ہوا تو انہیں سنٹرل جیل لاہور میں لے آیا گیا۔ ۳۱، جنوری ۱۹۳۵ء کی تاریخ پر ہائی کورٹ لاہور میں فیصلہ آپ کے

خلاف ہوا تو اس کے بعد ایک ہفتہ کے اندر ہی غازی ممدوح کو لاہور سے فیروزپور لے جایا گیا۔ عمائدین کے استفسار اور عوام کے اضطراب پر انتظامیہ نے موقف اختیار کیا کہ چونکہ آپ ضلع فیروزپور سے تعلق رکھتے ہیں، اس لیے بغیر کسی خاص وجہ کے ———— انہیں کسی اور مقام پر پھانسی نہیں دی جاسکتی مگر اصل سبب یہ تھا کہ حکومت کو ہندوؤں اور مسلمانوں کے مابین فساد کا زبردست خطرہ تھا۔

شہیدِ رسالت کے برادرِ خورد ایم ایس طاہر نے ایک ملاقات میں مجھے بتایا کہ ہمیں پانچ مارچ ۱۹۳۵ء کو آخری ملاقات کے لیے ضلعی جیل فیروزپور میں پابند کیا گیا۔ ہم لوگ طلوعِ آفتاب کے وقت جیل خانہ کے مین گیٹ پر پہنچ چکے تھے۔ غازی صاحب ہمیں نہایت خندہ پیشانی سے ملے اور تمام وقت ہنس ہنس کر گفتگو فرمائی۔ اُنہوں نے ہمیں صبر و ضبط کی خاص طور پر تلقین فرمائی اور فرمایا "خواہش تھی کہ میری زندگی کسی کام آئے اور میرا نام شمعِ نبوّت (صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم) کے جانثار پروانوں میں لکھا جائے۔ میں نے قصۂ زندگی کو بفضلہٖ تعالیٰ لہو کے چھینٹوں سے رنگین بنا لیا ہے۔ اِن شاء اللہ کل میری روح گنبدِ خضریٰ کے سائے میں شوخیٔ تقدیر پر سجدۂ تشکّر بجالا رہی ہو گی۔ میرے بعد ہرگز آہ و زاری اور واویلا نہ کریں۔ کہا، امّی جان! مجھے صرف قرآن اور صاحبِ قرآن (صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم) سے اُنس ہے، آپ بھی ہمیشہ انہی سے لَو لگائے رکھیں۔ میری خوشی اسی میں ہے کہ خدانخواستہ اگر پھر بھی کہیں کوئی گستاخِ رسولؐ جنم لے تو میرے متعلقین میں سے کوئی اُسے ٹھکانے لگا دے۔

۲۹، ذی قعد ۱۳۵۳ھ مطابق ۶ مارچ ۱۹۳۵ء بروز بدھ ساڑھے چھ بجے صبح آپ تختۂ دار کی طرف چلے۔ نپے تلے قدم، شیلی چال، آنکھوں میں مقدس چمک، دل تصوّرِ جاناں میں گم، اور ہونٹوں پر درود و سلام کے گلاب ———— حکام جیل نے آخری خواہش کے متعلق پوچھا تو فرمایا جن کی عزت و ناموس کا تحفظ کرتے ہوئے

اس مقام تک پہنچا ہوں، وہ بخوبی جانتے ہیں۔ میرے سرکار صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ادنیٰ غلام کی ہر تمنا پوری فرمادی ہے۔" جیل حکام سے روایت ہے اس وقت آپ کی زبان پر یہ الفاظ جاری تھے "میرے اللہ تیرا ہزار شکر کہ تو نے اپنے حبیب پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی عظمت کے تحفظ کے لیے مجھ ناچیز کو کروڑوں مسلمانوں میں سے منتخب فرمایا۔" پورے سات بجے غازیؒ تختۂ دار پر کھڑے تھے۔ کنٹوپ چڑھا دیا گیا۔ نہایت زور سے نعرہ بلند فرمایا پھر گویا ہوئے "میں حاضر ہوں یارسول اللہ.... .... الصلوٰۃ والسلام علیک یارسول اللہ .... لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ۔" اسی ثانیے جلاد اشارہ پاکر آگے بڑھا اور ذرا دیر بعد سولی پر لٹک رہے تھے۔

قربان گاہ میں خونِ دل کی حدت سے مشعلِ وفا کو فروزاں رکھنے والے اس خوبرو مجاہد کی عمر اس وقت ۱۲ سال تھی۔ یہ خبر پورے ملک میں پھیل چکی تھی کہ ۶ مارچ کی صبح حافظ غازی محمد صدیقؒ تختۂ دار پر لٹکائے جانے والے ہیں۔ ساتھ ہی کھیم کرن، پٹی، امرتسر، لاہور، گوجرانوالہ اور سیالکوٹ کے علاوہ گردونواح کے دیہات سے کافی زائرین جنازے میں شرکت کے لیے کھنچے چلے آرہے تھے۔ ۵ مارچ کی شام ہی سے قصور کے عوام نے اپنے کاروبار بند کرلیے۔ رات کو ہر طرف پڑاؤ ہی پڑاؤ نظر آتے تھے جن کا مقصدِ وحید شہیدِ ناز کی زیارت تھا۔ اگلے دن پورے شہر میں مکمل ہڑتال تھی۔ دکانوں کے علاوہ سکول اور کارخانے بھی بند رہے چونکہ انتظامیہ اور جملہ مجسٹریٹ بھی شہر کے انتظام میں مصروف تھے اس لیے عدالتیں سونی پڑی رہیں۔ نہ صرف پولیس اور تحصیل کے حکام مصروفِ انتظام تھے بلکہ ضلع کے حکام، پولیس اور فوجی افسروں نے بھی جن میں گوروں کی بڑی تعداد تھی، آنے جانے والوں پر کڑی نگاہ رکھی۔ چونکہ نقضِ امن عامہ کا زبردست خطرہ تھا، اس لیے انتظامات بہت سخت کردیے گئے تھے۔

سات بجے صبح فیروزپور ڈسٹرکٹ جیل میں غازی محمد صدیقؒ کو جامِ شہادت

پلا دیا گیا۔ قصور اور فیروزپور کے مسلمان کافی تعداد میں اپنے غازی کی نعش حاصل کرنے کے لیے جیل کے دروازے تک پہنچ چکے تھے۔ آٹھ بجے کے قریب جیل کے عملے نے شہیدؒ کی لاش ورثا کے حوالے کردی۔ پھولوں سے سجی ہوئی ایک لاری میں جو پہلے سے تیار کھڑی تھی۔ آپ کو قصور لایا گیا۔ مسلمانانِ فیروزپور کی خواہش تھی کہ جنازہ وہاں پڑھا جائے مگر حکام کی سخت تنبیہ کے سبب اس کو عملی جامہ نہ پہنایا جاسکا۔ فیروزپور سے قصور تک سڑک کے دورویہ لاتعداد کلمہ گو کھڑے تھے جو عقیدت میں ڈوب کر درودِ پاک کا ورد کرتے ہوئے قافلۂ شوق پر پھولوں کی بارش برساتے رہے۔ مختلف مقامات پر ہزاروں عقیدت مند شہیدِ رسالتؐ کی زیارت سے مشرف ہوئے۔ جنازہ عیدگاہ کے قریب اسلامیہ ہائی سکول قصور (موجودہ بوائز ڈگری کالج) کے ہال کمرے میں رکھا گیا تھا جہاں اَن گنت مسلمان پرنم آنکھوں سے شہید کی زیارت سے فیض یاب ہو رہے تھے۔ لوگ ایک دروازے سے داخل ہوتے اور دوسرے دروازے سے نکل جاتے تھے۔ کافی دیر تک پردہ نشین مستورات شہید کا چہرہ مبارک دیکھنے کو آتی رہیں۔

ٹھیک ایک بجے جنازہ اُٹھایا گیا اور جلوس کی صورت میں نصف میل کا فاصلہ پورے تین گھنٹے میں طے ہوا۔ نمازِ جنازہ پریڈ گراؤنڈ میں ادا کی گئی جس میں محتاط اندازے کے مطابق ایک لاکھ سے زائد افراد نے شرکت کی۔ جنازے کو کندھا دینے کے لیے چارپائی کے ساتھ لمبے لمبے بانس باندھے گئے تھے۔ آپ کے جسدِ مبارک کو قبرستان میں پہنچایا گیا اور فدائیِ حبیبِ کبریا (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) غازی محمد صدیق شہیدؒ کو پورے چھ بجے شام سپردِ خدا اور رسول (جل شانہٗ، وصلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کردیا گیا۔ شہید رسالت کا عظیم منصب عطا ہونے پر غازی محمد صدیقؒ کی والدہ صاحبہ نے دیگر خواتین کو بھی اس موقع پر چیخ پکار سے سختی کے ساتھ منع کررکھا تھا۔ جب کوئی عورت تعزیت کی غرض سے اُن کے پاس آتی تو آپ فرماتیں "اس واقعہ پر غم واندوہ کا کیا جواز ہے؟ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر قربان ہونا تو خوشی کا مقام ہے۔"

غازی محمد عبداللہ شہید علیہ الرحمہ

نام عبداللہؒ قوم انصاری
شمعِ ناموس کا تھا پروانہ
سُن کے پھانسی کا حکم منصف سے
کیوں نہ پڑھتا نمازِ شکرانہ

—

حُرمتِ آقاؐ پہ ہو قربان، لازم تھا اُسے
خواب میں سرکارؐ نے خود حکم جب اُس کو دیا
قتل غازیؒ نے کیا چلچل کو، اور دلجیت کو
وہ تھی وجہِ ارتداد، اور یہ تھا مرتد بے حیا

—

ایک بے غیرت کہ بدقسمت بھی تھا، بے راہ بھی
پہلے تھا نورِ محمدؐ، پھر وہ چلچل سنگھ بنا
اور ڈھایا اک ستم، سرکارؐ کی توہین کی
کیوں نہ غازیؒ قتل کرتا اُس کو، سو اُس نے کیا

راجا رشید محمود

مُرتد چلچل سنگھ کو واصلِ جہنم کرنے والے

غازی محمد عبداللہ شہید علیہ الرحمہ

تحریر: رائے محمد کمال

طلوعِ اسلام سے تا ہنوز شمع رسالتؐ کے ایسے پروانوں اور حضور ختمی مرتبت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے ان دیوانوں کی تعداد بہت زیادہ ہے جنہوں نے ذوق و شوق اور خلوص و عقیدت سے فداکاری و جاں سپاری کی نئی داستانیں رقم کیں۔ لیکن تاریخ گواہ ہے کہ اس فریضۂ عشق کو جتنی پابندی اور جرأت ایمانی کے ساتھ برصغیر پاک و ہند میں نبھایا گیا، وہ اپنی مثال آپ ہے۔ ہندوستان کے طول و عرض میں اگر کسی ایک عاقبت نااندیش نے آقا حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی توہین کی جسارت کی تو سینکڑوں عاشقانِ نبیؐ خنجر بکف تکبیر بلب آگے بڑھے اور مردودِ ازلی کو جہنم رسید کر دیا۔ وقتاً فوقتاً گستاخان و بے ادبانِ رسولؐ اور مشرکان و کافران ملعون کے پیٹ چاک ہوتے رہے۔

برطانوی ہند میں اس سلسلے کی پہلی باقاعدہ کڑی غازی عبدالرشید شہیدؒ (دہلی) ہیں لاہور میں چراغِ وفا کو خونِ جگر سے فروزاں رکھنے والے دوسرے مجاہد کا نام غازی علم الدین شہیدؒ ہے۔ کراچی میں عزت و ناموس رسول (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے تحفظ کی مشعل غازی عبدالقیوم شہیدؒ نے جلائی۔ اس باب میں قصور سے دو مجاہدین کے نام سامنے آتے ہیں۔ ایک غازی محمد صدیقؒ جبکہ دوسرے سرفروش کو ہم غازی محمد عبداللہ شہیدؒ کے نام نامی اسم گرامی سے جانتے ہیں۔ بتایا جاتا ہے کہ غازی عبداللہ انصاری موضع پٹی ضلع قصور کا رہنے والا اور باعتبارِ پیشہ جولاہا تھا۔ عمر تیس تبیس کے پیٹے میں، خوبصورت چہرہ اور گوری رنگت، بھری بھری سیاہ داڑھی۔ جب آپ کو پروانۂ ماموریت ملا تو عالم شباب کا جوش و جذبہ بدرجۂ اتم موجود تھا۔ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اس جانثار کا واقعہ بڑا عجیب ہے۔

قصور کی ایک بدنام بستی میں زندگی کے شب و روز گزارنے والا یہ فقیرِ بے نوا
مقدّر کا دھنی تھا۔ صدق و صفا کی دولت سے مالا مال یہ عظیم مجاہد تاجدارِ مدینہ (صلی اللہ
علیہ وآلہٖ وسلم) کی زیارت سے شرف یاب ہوا۔ سرکار صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے فرمایا،
صوفی عبداللہ، یہ مرتد مجھے دکھ پہنچا رہا ہے۔ جاؤ اور اس منافقِ ازلی زبان بند کرو۔ اب
صوفی عبداللہ کو یہی فکر دامن گیر تھی کہ کب اور کس طرح فرمانِ نبی (صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم)
کو نبھائے؟ نماز پڑھ کر پہروں چُپ چاپ بیٹھا رہتا اور دلی آرزو کو ہمکنارِ تکمیل کرنے
کی سکیم سوچتا۔ بالآخر کہیں سے ایک معمولی چھُری خریدی، اُسے تیز کیا اور یہ راز اپنے سینے
میں چھپائے شاتمِ رسولؐ کی تلاش میں نکل پڑا۔ اس کا شکار لاہور سے سرگودھا روڈ پر
واقع ایک قصبہ خانقاہ ڈوگراں سے کچھ دُور ایک بستی میں موجود تھا۔

۱۰/ اکتوبر ۱۹۸۶ء کو راقم الحروف نے اس جگہ سے تفصیلی معلومات حاصل کیں۔
خانقاہ ڈوگراں سے بجانبِ جنوب چک ۱۲۴ خورد میں بہت سے افراد بقیدِ حیات ہیں
جنہوں نے قبل از آزادی اس واقعہ کو بچشمِ خود دیکھا۔ میں نے یہاں بہت سے لوگوں سے
ملاقات کی۔ برکت علی چوہدری، حاجی رحمت اور غلام محمد، دلدار وڈھ ذات واہلہ بعمر
۷۵ سال کی زبانی بعض بالکل نئی تفصیلات حاصل ہوئیں۔ آخر الذکر نے بتایا "مردود
مذکورہ چلچل سنگھ پہلے مسلمان تھا اور اس کا نام نور محمد تھا۔ وہ شاہنواں ماڑی سے ایک
عورت کو اغوا کرکے روپوش ہو گیا۔ چونکہ اس معاملے نے بہت طول پکڑ لیا تھا اور پولیس
ہر وقت تعاقب میں رہتی تھی، اس نے بچاؤ کے لیے سکھوں کی پُشت پناہی چاہی۔
سکھوں نے شرط عائد کی کہ جب تک تم ہمارے مذہب میں داخل نہیں ہوتے، ہم تمہاری
مدد نہ کریں گے۔ وہ چھوکری کے عشق میں دیوانگی کو جا پہنچا تھا۔ لہٰذا بغیر سوچے سمجھے سکھ مت
میں داخل ہو گیا اور اپنے ہم مذہبوں کے سالانہ جلسے میں جو ۱۲۴ (بڑی) میں منعقد ہوا
کرتا تھا، رسولِ پاک (صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم) کے متعلق نازیبا کلمات کہے۔ اس نے کہا کہ
پہلے مجھے صحیح علم نہ تھا۔ اب سکھ مت کی پیروی اختیار کی ہے تو پتا چلا کہ مسلمانوں کے
نبی تو ...... ہیں (استغفراللہ) بتایا گیا۔" ان دنوں ارد گرد کی بیشتر اراضی بنجر پڑی

تھی اور گھنے درختوں کے سبب جنگل کا منظر نظر آتا۔ غازی میاں عبداللہؒ نے جب اُدھر کا
رُخ کیا تو ایک دکاندار دین محمد کے پاس بھی ایک دو مرتبہ آئے وگرنہ اکثر وہ اس مرتد کی
تلاش میں رہتے اور کھجوریں کھا کر گزر بسر فرما لیتے۔

ایک روز کی بات ہے چلچل سنگھ اور اس کی معشوقہ دلجیت کور اپنی زمین پر تھے۔
سڑک پر موجود جو کھال ہے چلچل سنگھ اُسی پر چلتا ہوا نظر آیا۔ اتنے میں حضرت غازی علیہ
الرحمۃ بھی وہاں پہنچ گئے۔ جونہی آپ اُس کے نزدیک پہنچے تو با آوازِ بلند للکارا کہ اے دشمنِ
رسولؐ آج میں تیری موت کا پیغام بن کر آ گیا ہوں۔ اس کے پاس کرپان تھی جبکہ آپ کے
کے ہاتھ میں صرف چھُری۔ دونوں گتھم گتھا ہوئے اور غازی نے موذی کو وہیں ڈھیر
کر دیا۔ اس کے بعد دلجیت کور کی طرف دوڑ لگائی۔ وہ دہشت سے سہم چکی تھی۔ ان کو
اپنی سمت آتے دیکھا تو واویلا کرنے لگی کہ خدا کے لیے مجھے معاف کر دو۔ آپ نے فرمایا ابھی
معاف کرتا ہوں۔ وہ خوف کے مارے توریا کی فصل کے گرد گھومنے لگی لیکن کب تک؟ آپ
نے اسے پکڑا اور شہ رگ کاٹ دی۔ پھر چنچل سنگھ کی مکروہ لاش پر آئے تو دیکھا کہ ابھی سانس
باقی ہے۔ آپ نے نہایت اطمینان کے ساتھ اس کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا۔ ازاں بعد نہر
پر غسل فرمایا۔ کپڑوں پر سے ناپاک خون کے قطرے دھوئے اور نزدیک ہی برنالہ کی
مسجد میں آ کر نوافل شکرانہ ادا فرمائے۔ اتنے میں پولیس آ گئی۔ وہ پہلے ہی نزدیکی گاؤں
زنگڑ نگر میں کسی مقدمے کے سلسلے میں موجود تھی۔ روایت ہے جب آپ کی گرفتاری عمل
میں آئی تو غازی محمد عبداللہؒ اتنے خوش اور ہشاش بشاش تھے جیسے شادی میں آئے
ہوں۔ بہرکیف چالان مکمل ہوا۔ مقدمہ شیخوپورہ عدالت میں چلتا رہا۔ آپ کی طرف سے
فاضل قانون دان ملک محمد انور ایڈووکیٹ (یہ قیام پاکستان کے فوراً بعد گورنر کے مشیرِ اعلیٰ
مقرر ہوتے تھے) پیش ہوئے۔ قریباً ایک برس مرافعہ زیرِ سماعت رہا۔ بالآخر آپ کے
لیے سزائے موت تجویز کی گئی۔ کیوں نہیں! آپ کے نصیب میں تو بارگاہِ رسالت صلی
اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی حاضری لکھی تھی، شہادت سے سرفراز کیے جانے کی خوشخبری سن کر
ان کا چہرہ بشاشت سے چمک اُٹھا۔

ڈاکٹر محمد اختر چیمہ نے غازی محمد عبداللہ شہیدؒ کے بارے میں لکھا ہے کہ جب آپ چلچل سنگھ کو جہنم رسید فرما چکے تو پھر یہ جری مجاہد اور مردِ غازی بڑے اطمینان کے ساتھ قریبی سیم نالہ کی طرف گیا۔ وہاں غسل کیا، کپڑے دھوئے اور نوافل شکرانہ ادا کیے کہ خدا تعالیٰ نے اسے اس کام سے عہدہ برآ کیا اور کامیابی سے ہمکنار فرمایا۔ چونکہ وہ تحصیل قصور کا رہنے والا تھا، ضلع شیخوپورہ میں گواہ اس کی شناخت نہیں کر سکتا تھا اس بات کی آڑ میں مقدمہ کے دوران بعض مسلمانوں نے اُن کو مالی و قانونی امداد کی پیش کش کرنے کے علاوہ یہ مشورہ بھی دیا کہ وہ اقبالِ جُرم نہ کریں تو بآسانی عدالت سے بری ہو سکتے ہیں، مگر عشقِ رسولؐ کے متوالے اور ناموسِ رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اس دیوانے نے کسی پیش کش کو قبول نہ کیا اور کہا کہ میں اِس ثوابِ عظمیٰ اور سعادت دارین سے محروم نہیں رہنا چاہتا۔ چنانچہ مقدمہ سیشن سپرد ہوا تو وہاں بھی مردِ مجاہد نے بصد خوشی اعترافِ قتل فرمایا۔ انھیں اس جرم کی پاداش میں لاہور جیل میں پھانسی دی گئی اور اس شہید ملّت کی لاش کو گمنامی کی حالت میں موضع پٹی مال تحصیل امرتسر (بھارت) میں سپردِ خاک کر دیا گیا۔

راقم الحروف کی معلومات کے مطابق آپ کو لاہور میں نہیں بلکہ شیخوپورہ میں جامِ شہادت پلایا گیا تھا۔ علاقہ خانقاہ ڈوگراں کے مسلمان بضد تھے کہ آپ کو چک ۱۲۴ چھوٹی کے قبرستان میں ایک عظیم ولی اللہ کے پہلو میں دفن کیا جائے مگر شہیدِ رسالت کے لواحقین نے اس کی اجازت نہ دی اور میت کو اپنے آبائی گاؤں میں لے گئے۔ ایک بیان کے حوالے سے یہ واقعہ تقسیم سے غالباً پانچ برس پہلے یعنی ۱۹۴۲ء کلھا ہے جبکہ دوسری روایت کے مطابق ۱۹۳۸ء میں پیش آیا تھا مگر ایک بات بڑی دلچسپ ہے اور عبرتناک بھی کہ چلچل سنگھ جو پہلے مسلمان تھا اور نور محمد نام رکھتا تھا، اس کی پہلی اہلیہ سے چار بیٹے ہیں جن کے اسماء علی الترتیب درج ذیل ہیں۔ محمد طفیل، محمد حسین، غلام رسول اور رحمت علی بفضلہٖ تعالیٰ چاروں بھائی سچے عاشقِ رسولؐ اور پکے مسلمان ہیں۔ وہ کم ظرف اور سیاہ بخت باپ کا نام سننا

بھی گوارا نہیں کرتے۔ میں نے مقتول مردود کی پہلی مسلمان شریکۂ حیات "فضل بی بی" سے تاثرات معلوم کرنا چاہے تو انہوں نے نفرت سے منہ دوسری جانب پھیر لیا اور کہنے لگیں "ہم لوگ اس بے غیرت اور بے ایمان اور ملعونِ زمانہ کا نام سننا بھی برداشت نہیں کر سکتے۔ الحمدللہ ہم مسلمان ہیں اور میں مائی عائشہ صدّیقہؓ اور خاتونِ جنّت حضرت فاطمہؓ کی ایک ادنیٰ کنیز ہوں۔ وہ ہمارے پیارے رسول مقبولؐ کا دشمن ہو گیا تھا۔ ہمارا اس ناپاک ملیچھ سے کیا تعلق؟ کاشـــــ یہ لعنتی ہماری زندگیوں میں نہ آیا ہوتا۔" مزید معلوم ہوا کہ مرتد چلچل سنگھ کے مقدمہ کی پیروی سکھوں ہی نے کی۔ اس کے مسلمان رشتہ داروں اور اولاد نے قطعاً کوئی دلچسپی نہ لی بلکہ اس پاپی کے مر جانے پر انہوں نے اپنے گھروں میں جشنِ مسرّت منایا۔

غازی محمد عبداللہ شہیدؒ کے آبائی گاؤں اور آخری آرام گاہ کے متعلق کوئی شخص بھی وثوق سے کچھ نہ بتا سکا۔ بعض جگہوں میں موضع پٹی مال بیان ہوتا ہے مگر برخلاف اس کے، مذکورہ بستی کے بعض سن رسیدہ افراد نے آپ کے مولود و مسکن کا نام "کوئے" بتایا۔ اس نام کا ایک گاؤں قصور روڈ پر واقع معروف قصبہ کاہنہ کہنہ سے ذرا فاصلے پر بھی موجود ہے مگر وہاں اس امر کی کوئی کڑی نہیں ملتی۔ کاش خبر چل جاتی کہ اصل مقام کونسا ہے اور کہاں ہے؟ یوں ممکن تھا کہ آپ کے حالات و واقعات پر مبنی ایمان پرور سوانح عمری منظرِ عام پر آ سکتی اور میرا مشن مرحلۂ تکمیل میں داخل ہو جاتا جس کا عہد میں نے اپنے کریم آقا و مولا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے کر رکھا ہے۔

شہیدو!

ناموس رسالت کے وفادار شہیدو!
اللہ کی رحمت کے سزاوار شہیدو!

اللہ رے یہ گرمیٔ بازار شہیدو
خود بکتے ہو آکر تہِ تلوار شہیدو

اسلام کی بنیاد میں خوں تم نے بھرا ہے
اے دینِ محمدؐ کے پرستار شہیدو

جب دیکھا ہے برہم تمھیں میدان وفا میں
دم توڑ گئی کفر کی یلغار شہیدو

خود بکتے ہو آ کے شہادت کی طلب میں
اللہ رے یہ گرمیٔ بازار شہیدو

جس نقطہ پہ رقصاں ہے مشیّت کا اشارہ
اس نقطۂ عظمت کی ہو پرکار شہیدو

سیّد ہلال جعفری (ملتان)

شمعِ رسالتؐ کے دو گمنام پروانے

تحریر: رائے محمد کمال

۲۲ فروری ۱۹۳۱ء کو گڑھی شاہو، لاہور میں مسلمانوں کا ایک احتجاجی جلسہ زیرِ صدارت صوفی غلام نبی صاحب بی۔اے (ہیڈ ماسٹر اسلامیہ سکول کوہ منصوری) منعقد ہوا۔ اس میں جناب مولانا غلام محمد مکی نے ایک طویل و جامع تقریر بہ آقائے نامدار سیّدِ الکونین (صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم) کے اوصاف و فضائل میں فرمائی بعد میں صوفی صاحب نے مختصر لیکن نہایت ہی پُرجوش الفاظ میں خطاب کیا۔ اسلامیانِ گڑھی شاہو کا یہ عظیم الشّان اجتماع بنگالی زبان میں مطبوعہ ایک رسوائے زمانہ کتاب "پراچین کہانی" کی مذمت اور اظہارِ غم و غصّہ کے لیے ہُوا تھا۔ اس کا لکھاری ایک بدزبان اور کمینہ فطرت ہندو بھولا ناتھ سین تھا۔ بدنام رسالے میں خواجۂ دو جہاں باعثِ تخلیقِ کون و مکاں حضرت محمد مصطفیٰ احمدِ مجتبیٰ (صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم) کا ایک مصنوعی فوٹو اور گستاخانہ عبارتیں شامل تھیں۔ جلسے کی کارروائی کے دوران سامعین زار و قطار رو رہے تھے۔ ہر طرف آنسوؤں کی جھڑی لگی ہوئی تھی۔ شدّتِ غم سے چند عاشقانِ رسولؐ کی ہچکیاں بندھ گئیں۔ بے غیرت مصنف مذکور کے بارے میں نفرت و حقارت کا اظہار کر کے جلسہ کیا منتشر ہوا، شاتمِ نبیؐ پر غیظ و غضب کی ایک بجلی گری جس میں یہ کم بخت تر گیاش ہوا اور ساکنانِ گڑھی شاہو کے غیوّر و جسور ہونے پر زمانے نے بھرپور گواہی دی۔

کلکتہ میں شائع ہونے والی اس کتاب کے خلاف ہندوستان بھر کے مسلمانوں نے صدائے احتجاج بلند کی۔ متعدد مقامات پر مظاہرے ہوئے۔ اسلامی جرائد و رسائل میں اس کی تردید میں بیسیوں مضامین لکھے گئے اور حکومت سے پُرزور مطالبہ کیا گیا کہ

نا پاک کتاب کے مصنف اور ناشر کو قرار واقعی سزا دی جائے۔ کیونکہ اس نے امنِ عامہ کو شدید نقصان پہنچایا اور مسلمانانِ عالم کے جذبات و احساسات کو بُری طرح مجروح کیا ہے۔ بعض اخبارات میں راجپال کے واقعۂ قتل کو زیرِ بحث لا کر لکھا گیا کہ تمام مسلمان اپنے آقا و مولا (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی حرمت پر تن من دھن قربان کر دینے میں فخر محسوس کرتے ہیں مگر حکومت ٹس سے مس نہ ہوئی۔ دراصل آریہ سماجیوں کی پشت پر انگریز عملداری کا پورا پورا ہاتھ تھا اور ایک سوچی سمجھی سازش کے تحت برّصغیر پاک و ہند میں تحریکِ شماتتِ رسولؐ شروع کروائی گئی تھی۔ غلامانِ مصطفیٰ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے بھی اس مذموم تحریک کا ہر میدان میں، ہر وقت، ہر جگہ اور ہر طرح مقابلہ کیا۔ قانونی چارہ جوئیاں تو محض اتمامِ حجت کے طور پر ہوا کرتی تھیں تاریخ کے صفحات گواہ ہیں کہ جس طرح مسلم اُمّہ نے محسنِ انسانیت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی حُرمت و ناموس کا تحفظ کیا اور مختلف ادوار میں نوجوانانِ ملّت اپنے خون کا نذرانہ پیش کرتے رہے، اس کی مثال کہیں اور نہیں ملتی۔ عاشقانِ رسول (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) جس دل گردے، جراٗت مندی، صبر و تحمل اور ذوق و شوق کے ساتھ گستاخانِ نبیؐ پر جھپٹے، اس کا نمونہ کسی اور قوم نے آج تک پیش نہیں کیا۔ کلمہ گو مائیں اپنے بیٹوں کو پھولوں کے ہار پہنا کر سوئے مقتل روانہ کرتی رہیں۔ عفّت مآب بہنوں نے اپنے بھائی اس مقدس جذبے پر وار دیے اور نیک سرشت بیویوں نے اپنے سرتاج تاجدارِ مدینہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کے نعلین مبارک پر قربان کیے۔ یہ ولولہ، یہ جذبہ، یہ سعادت اس قوم کے مقدر میں کیوں نہ آتی۔ ملّتِ اسلامیہ کا خمیر ہی طیبہ کی مٹی میں گوندھا گیا ہو اور "با خدا دیوانہ باش و با محمد ہوشیار" اگر بحیثیتِ مجموعی نظریۂ حیات بن جائے تو پھر دیوانگانِ عشق بے خطر آتشِ نمرود میں کود ہی پڑتے ہیں۔ میرے سرکار (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا مقام و مرتبہ تو بہت بلند ہے۔ بقول شاعر۔

رُخِ مصطفیٰ ہے وہ آئینہ کہ اب ایسا دوسرا آئینہ
نہ ہماری بزمِ خیال میں نہ دکانِ آئینہ ساز میں

۷ رمئی ۱۹۳۱ء کو گیارہ بجے دوپہر دو خوش پوش نوجوان سین برادرز بک سیلرز، (کالج روڈ ہربنس پورہ کلکتہ) میں داخل ہوئے اور نہایت اطمینان سے ساتھ مصنف و پبلشر بھولا ناتھ سین اور اس کے ملازم مسمی ہری داس کے خنجر گھونپ دیے جبکہ ایک ہندو کلرک گوپال چند بینرجی ٹانگ وغیرہ پر زخم آجانے سے شدید زخمی ہوا اور کچھ دیر ہسپتال میں زیرِ علاج رہنے کے بعد واصل فی النار ہوگیا۔ استغاثہ کے مطابق مذکورہ تینوں سماج ہندوؤں کے قتل کی تفصیلات کچھ یوں ہیں کہ بھولا ناتھ نے ان کو اپنا گاہک خیال کیا اور ان سے پوچھنے لگا کہ آپ کیا خریدیں گے؟ انہوں نے جواباً نعرۂ تکبیر بلند کیا اور فضا میں بیک وقت دو خنجر لہرائے۔ اس کے نتیجے میں اوّل الذکر دونوں جہنّم رسید ہوئے جبکہ تیسرا شخص سخت مجروح ہوا۔ ایف آئی آر میں اندراج کے مطابق واردات کے فوراً بعد دونوں حملہ آور بڑے اعتماد کے ساتھ باہر نکل گئے۔

دلآزار کتاب کے ہندو مصنّف بھولا ناتھ سین تو مع اپنے ساتھیوں کے، کیفرِ کردار تک پہنچ چکا۔ اب یہ دیکھتے ہیں کہ شمعِ رسالت کے دونوں پروانے کون تھے اور کہاں سے آئے؟

یہ حوالہ بڑا حسرت افزا اور راحت انگیز ہے کہ اس کی کڑیاں گڑھی شاہو، لاہور میں انعقاد پذیر مذکورہ بالا جلسہ سے ملتی ہیں۔ حسنِ اتفاق دیکھیے کہ میاں عبداللہ خاں اور ان کے والد میراں بخش ریلوے ورکشاپ مغلپورہ میں ملازم تھے۔ دو چار ماہ قبل غازی میاں عبداللہ خاں کا تبادلہ لاہور سے امرتسر ریلوے ورکشاپ میں ہوا۔ موصوف ایک مدت گڑھی شاہو سے اس درجہ غیر متعلق رہے کہ عام طور پر لوگوں نے انہیں دس سال سے دیکھا تک نہیں تھا۔ مگر ان کی شوخئ قسمت تھی کہ غازی صاحب ۲۲ فروری کو اپنے محلہ ہی میں موجود تھے اور اس رات حزب الاحناف لاہور کی تحریک و تائید سے مسلمانوں کا جلسے میں جو "پرا چین کہانی" اور اس کے بنگالی مصنف کے خلاف بطور احتجاج ہوا تھا، اتفاقاً تشریف لے آئے۔ جلسے میں مختلف اصحاب کی تقریروں اور قرار دادوں سے انہیں معلوم ہوا کہ کلکتہ میں بھولا ناتھ نے

ایک کتاب "پراچین کہانی"، مرتب کی ہے اور وہ ہندو اکثریت کے علاقوں کے
مدارس میں داخل نصاب کی جا چکی ہے۔ اس میں آقائے دوجہاں محسن و ہادئ بنی نوعِ
انسان (صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم) کی اہانت آمیز تصویر بھی دی گئی ہے۔

اس اندوہناک معاملے کا علم ہونے پر انہوں نے تحفظِ ناموسِ رسالت کی خاطر
جامِ شہادت نوش کرنے کا پختہ عزم کر لیا۔ چنانچہ عید کے دن حضرت قبلہ غازی صاحب
لاہور آئے تو دوسرے دن اپنے قریبی دوست امیر احمد ولد محمد ابراہیم کو جن کا مکان
چوک رنگ محل میں ہے، ہمراہ لے کر کلکتہ کے لیے رختِ سفر باندھا۔ دونوں مخلص و
باوفا دوست کلکتہ پہنچے اور ایک مسافر خانے میں رہائش رکھی۔ اگلے روز دفترِ خلافت
میں گئے۔ یہاں انہوں نے کتاب اور ہتک آمیز فوٹو کا بچشم خود مشاہدہ کیا۔ وقوعہ کے
روز عاشقانِ مصطفیٰ (صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم) اور بدزبان مصنف کے درمیان مکالمہ بازی
کا بھی ذکر کیا جاتا ہے۔ بہرحال سُنتے ہیں کہ واردات کے بعد غازی امیر احمد صاحب
موقع پر ہی گرفتار ہو گئے جبکہ غازی عبداللہ خاں صاحب، بوقتِ شام مسافر خانہ کے
قریبی تھانے میں ازخود پہنچے اور قتل کی اطلاع دے کر گرفتاری دی۔ قابلِ غور بات یہ ہے
کہ میاں عبداللہ خاں غازی اور ان کے والدِ محترم بڑھئی کا کام کرتے تھے۔ مزید برآں
یہ کہ غازی امیر احمد صاحب بھی باعتبار پیشہ ترکھان تھے اور غازی علم الدین شہید علیہ الرحمۃ
کے دُور کے عزیز بھی بتلائے جاتے ہیں۔ ان کے والدین فوت ہو چکے تھے۔ ان کا کوئی
اور بھائی نہیں تھا۔

باقاعدہ تفتیش شروع ہوئی تو کلکتہ سے ایک پولیس انسپکٹر سیّد غلام حیدر شاہ
پشاوری لاہور میں وارد ہوئے اور تین چار یوم متواتر محرکاتِ قتل کا سراغ لگایا۔
عبداللہ خان کے گھر کی تلاشی لی گئی تو غازی علم الدین شہیدؒ کی بڑے سائز میں ایک تصویر
اور واردات کے اسباب وعلل سے غیر متعلقہ چند کاغذات برآمد ہوئے۔ اس کے
علاوہ انسپکٹر مذکور نے حزب الاحناف کے چند ارکان کو بھی جن کے اہتمام سے یہ جلسہ ہوا
تھا، بغرضِ دریافتِ حال بلوا لیا۔ پوچھ گچھ کے اس موڑ پر انہوں نے برملا کہا کہ جلسے

کا اہتمام وانتظام واقعی انہوں نے کیا۔ اس میں اظہارِ غیظ وغضب کی قرار دادیں
بھی منظور ہوئیں اور قرار پایا کہ ان کی نقول اخبارات کو بھیجی جائیں۔ ان قرار دادوں
میں حکومت پر زور دیا گیا تھا کہ یہ گمراہ کن کتاب ضبط کی جائے اور مصنف کے خلاف
قانونی چارہ جوئی عمل میں لائی جائے ــــ انسپکٹر نے مسلم اخبارات بالخصوص روزنامہ
"سیاست"، لاہور کی ان رودادوں کو بھی جو ان جلسوں سے متعلق تھیں، جمع کیا اور
تفصیلی معلومات کے ساتھ کلکتہ پہنچ گیا۔

غازی امیر احمدؒ جائے واردات سے کچھ فاصلے پر بجانب شمال ایک گلی میں
گرفتار ہوئے اور غازی عبداللہ خاں بصد شوق ازخود پولیس سٹیشن گئے۔ انہوں نے
پولیس کے روبرو نہایت بیباکی اور جوانمردی کے ساتھ بیان فرمایا: "ہم نے ہی ان
نابکاروں کو بقائمی ہوش و حواس اور پورے پروگرام کے ساتھ واصلِ جہنّم کیا ہے۔
اس فعل پر ہمیں نہ کسی نے اکسایا، نہ سازش میں کوئی شریک ہے۔ ہم اب بھی خوش و خرم
اور اپنے اس عمل پر نازاں ہیں اور ان شاء اللہ ہمیشہ اپنی کامیابی پر اظہارِ تشکر کرتے
رہیں گے۔ ہم نے اپنے آقا و مولا (صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم) کی حرمت کے تحفظ اور آپؐ کی
توہین کا بدلہ لینے کے لیے قتل کا ارتکاب کیا ہے اور آئندہ بھی کسی ایسے خبیث و دیّوث
کو ہرگز معاف نہ کریں گے۔ وہ مسلمان ہی کیا جو اپنے پیارے نبی (صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم)
کی توہین ہوتی دیکھے اور خاموش رہے۔ جذبۂ عشق اور ایمان کا تقاضا ہے کہ گستاخانِ
نبیؐ کو موت کے گھاٹ اتارا جائے اور ان کی بوٹیاں آوارہ کتّوں کے آگے ڈال دی جائیں"۔

مقدمہ کی تاریخِ سماعت نزدیک آئی تو کلکتہ سے ایک مسلمان وکیل کی طرف سے
میاں عبداللہ خان اور میاں امیر احمد صاحب کے رفقاء کو تار موصول ہوئے کہ پیروی
کے لیے یہاں پہنچو۔ بیان ہے کہ غازیانِ ملت کے متعلقین مفلوک الحال تھے مگر باوجود
اس کے ان کو بہرحال کلکتہ جانا تھا۔ امیر احمد صاحب کے چچا زاد بھائی اور ان کی خالہ
صاحبہ ملاقات اور پیروئ مرافعہ کے لیے کلکتہ گئے جبکہ عبداللہ خان کے والدِ ماجد امرتسر
ہوتے ہوئے کہ وہاں ان کی رشتہ داری تھی، کسی ایک عزیز کے ساتھ وہ بھی اپنے

لختِ جگر کی ملاقات کو پہنچ گئے۔

اگست ۱۹۳۱ء تک مسلم آزار کتاب "پراچین کہانی" کے ہندو مصنف اور اس کے دو ملازموں کا مقدمۂ قتل کلکتہ ہائیکورٹ کے سیشن جج بورٹ ولیمز کی عدالت میں زیرِ سماعت رہا۔ گو استغاثہ اثباتِ جرم میں بُری طرح ناکام رہا۔ ارتکابِ قتل کے موقع کا کوئی گواہ تھا ہی نہیں۔ صرف ایسے گواہان پیش ہوئے جنہوں نے ملزمین کو بھاگتے ہوئے دیکھا یا ان میں سے ایک کے ہاتھ میں چھُری دیکھی۔ دورانِ سماعت ملزمان کی شناخت سے متعلق گواہ بھی عجب بدحواسی کا شکار نظر آتے۔ ایک گواہ نے وکیل استغاثہ کی انتہائی کوشش اور اعانت کے باوجود بار بار عبداللہ خان کو امیر احمد اور امیر احمد کو عبداللہ خان بتایا۔ اس مضحکہ خیز ناواقفیت پر مستزاد یہ کہ از روئے قانون امیر احمد کے خلاف کوئی واضح ثبوت موجود نہ تھا۔

ناموسِ رسالت کے ان دو محافظوں کے مرافعے میں کلکتہ کے ایک مسلمان وکیل اور مسٹر کریکوری دفاع میں پیش ہوئے۔ انہوں نے مختلف پیشیوں میں دلائل کے ساتھ ثابت کرنا چاہا کہ ملزمان بالکل بے گناہ ہیں۔ ان کو قلتِ ثبوت اور شک کا فائدہ بھی پہنچتا ہے نیز بعض دیگر قانونی حالات کا تقاضا ہے کہ کم از کم فرض کیے گئے قاتلوں کو سزائے موت نہ دی جائے بلکہ اسے حبسِ دوام بعبور دریائے شور میں تبدیل کریں۔ المختصر وکلاء کی قانونی نکتہ سنجیاں بجا لیکن غازیانِ قوم نے سیشن کورٹ میں بھی پُراعتماد لہجے اور یقین و ولولہ کے ساتھ فرمایا۔

"یہ گواہ جھوٹے مگر مقدمہ سچا ہے۔ ہم نے ہی خوب سوچ سمجھ کر ان مردودانِ ازلی کو ہلاک کیا۔ ہم نے ارتکابِ فعل سے انکار کیا ہے نہ کبھی کریں گے، وجہِ قتل بہت عظیم و ارفع اور ہمارے لیے سکون بخش ہے۔ ہمارا مقتولوں کے ساتھ زن، زر یا زمین کا کوئی جھگڑا نہیں تھا۔ بدبخت ناشر و مصنف نے حضور محبوبِ خدا (صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم) کی توہین پر مبنی کتاب شائع کی (اور ہم) نے اپنا مذہبی فریضہ ادا کیا۔ رسولِ پاک (صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم) کی عزّت و

ناموس کا تحفظ مسلمان قوم پر فرضِ کفایہ ہے۔ ہم خوش قسمت ہیں کہ ان ذلیل کتّوں کی ہلاکت ہمارے ہاتھوں سے ہوئی۔ عدالت زیادہ سے زیادہ سزا دے سکتی ہے، دے لے۔ بارگاہِ رسالت مآب (صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم) سے ہمیں اس قربانی کا اجرِ عظیم ملے گا۔

سیشن جج نے اپنے فیصلے میں لکھا کہ ملزمان مذکور خان عبداللہ خان اور امیر احمد نے اعترافِ فعل کیا ہے اور واقعی یہ اس واردات کے ذمہ دار ہیں۔ لہٰذا دونوں ملزمین کے لیے سزائے موت تجویز کی جاتی ہے ـــــ ان دو عاشقانِ رسالت کو ہائی کورٹ وغیرہ میں اپیل سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ تاہم مسلمانانِ کلکتہ میں ازحد جوش و خروش تھا۔ جب پیشی کے دوران میں غازیانِ ملت عدالت میں لائے جاتے تو لاکھوں کی تعداد میں فرزندانِ توحید زیارت کو ٹوٹ پڑتے۔ بعض اوقات سرگرم نوجوانوں نے اپنے ان مجاہدین کی حمایت و محبت میں عدالت کے اندر اور باہر بہت بڑے مظاہرے کیے۔ ہائی کورٹ کلکتہ میں بھی یہ فیصلہ بحال رہا اور ۱۲ فروری ۱۹۳۲ء کا دن سزا پر عملدرآمد کے لیے مقرر کر دیا گیا۔ لیکن چند دن پہلے ہی بعض ناگزیر وجوہ یا مصلحتوں کی بنا پر تاریخ ملتوی کر دی گئی۔ ادھر حکومتِ بنگال کی طرف سے حکومتِ ہند کو ٹیلیگرام دیا گیا کہ پھانسی کی سزا حبسِ دوام سے بدل دیں۔ مگر صوبائی گورنمنٹ کی یہ استدعا درخورِ اعتنا نہ سمجھی گئی۔ غالباً شمعِ رسالت کا مقدّر بامِ عروج پر تھا اور قُدرت کو گوارا نہ ہوا کہ محبّانِ رسول (صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم) کو شہادت کے انعام سے محروم کر دیا جائے۔

یہی سبب تھا کہ ۹ مارچ ۱۹۳۲ء کو فدایانِ رسولِ اکرمؐ (عبداللہ خاں اور میاں امیر احمد) مرتبۂ شہادت پر فائز ہو گئے۔ گو یومِ شہادت سرکاری طور پر مشتہر نہ کیا گیا تھا اور نہ ہی علاقے میں اس کی اطلاع تھی، لیکن پھر بھی محتاط اندازے کے مطابق پچاس ہزار مسلمانوں نے نمازِ جنازہ میں شرکت کی۔ بیان ہے کہ شہادت کے وقت نہ صرف شمعِ رسالت کے دونوں پروانے ہشاش بشاش تھے بلکہ لمحۂ وصال

کے بعد ان کے چہروں سے نُور برستا تھا اور حُسن وجمال کچھ اس طرح نکھرا کہ دیکھنے والے دیکھتے ہی رہ گئے۔

پھانسی دیے جانے کے بعد پولیس شہداء کی نعشوں کو اسلامی قبرستان میں لے گئی جو جیل سے دو میل کے فاصلے پر ہے۔ یہاں نعشیں اس سمجھوتے کے مطابق جو ایک شب پہلے متعلقہ حکام اور مسلم لیڈروں کے مابین طے پایا، شہدانِ ناز کے اعزہ و اقربا کے حوالے کردی گئیں۔ ورثاء نے اپنے شہداء کے ساتھ جیل میں آخری مرتبہ ایک بجے شب کو ملاقات کی تھی اور پھانسی دو گھنٹہ بعد ہوئی۔ بتایا جاتا ہے کہ ہر دو شہداء کو ایک دوسرے کے پاس تختۂ دار پر چڑھایا گیا۔ اس موقع پر شہداء کی وصیّت کے مطابق مسلمان مکمل طور پر پُرامن رہے۔ تاہم شہر کے اکثر مسلمانوں نے ہڑتال کی، دکانیں بند رکھیں اور فرزندانِ توحید کا ایک جمِ غفیر مسجد ناخدا میں جمع ہو گیا۔ پولیس بہ تعدادِ کثیر متعین تھی۔ ایک دن قبل پولیس، سارجنٹ اور گورکھا فوج کے متعدد دستے چوراہوں اور دوسرے اہم مراکز پر تعینات تھے۔ شہداء کو مسلح پولیس کی حفاظت میں قبرستان تک پہنچایا گیا۔ قبرستان میں پچاس ہزار افراد پر مشتمل ہجوم کے ایک حصّہ نے شہداء کے اجسام حاصل کرکے جلوس نکالنے کی کوشش کی۔ اس سے جوش اور سنسنی پھیل گئی لیکن بر وقت مداخلت اور ممتاز و سرکردہ مسلمان رہنماؤں کے کہنے پر رضاکاروں نے صورتِ حال کو نازک ہونے سے بچالیا اور قبرستان کے دروازے بند کر دیے۔ اس پر پولیس نے رضاکاروں کو ان کے حال پر چھوڑ دیا اور تدفین وغیرہ کے مراسم بغیر کسی رکاوٹ کے عمل میں آئے۔ انتظامیہ نے یہ بھی فیصلہ کیا کہ احتیاطاً ایک ہفتہ سے زائد عرصہ تک قبرستان کی حفاظت کرے گی۔

ع : صلۂ شہید کیا ہے؟ تب و تابِ جاودانہ

۱۵ مارچ ۱۹۳۲ء کو مجلسِ خلافت کلکتہ کا ایک جلسہ زیرِ صدارت مسٹر حسین شہید سہروردی منعقد ہوا۔ اس میں شہدانِ رسالت، خان عبداللہ خاں اور میاں امیر احمد کو زبردست خراجِ تحسین پیش کیا گیا اور حسین شہید سہروردی صدر مجلس خلافت

نے اپنی دلی ہمدردی کے اظہار میں اعلان کیا کہ میں شہید عبداللہ خاں کے شیرخوار بچّہ (میری معلومات کے مطابق ان کی پیدائش ۲۵ مئی ۱۹۳۱ء کو ہوئی) کو بیس روپیہ ماہوار دیا کروں گا۔ جب تک وہ سن شعور کو پہنچ کر خود اپنی ضروریات کو پورا کرنے کے قابل نہ ہو جائے ——— ۱۸ مارچ بروز جمعۃ المبارک کو تمام مساجد میں یومِ شہیدانِ رسالت منانے کا فیصلہ کیا گیا اور تمام مساجد میں قرآن خوانی کا بھی اہتمام ہوگا۔

بدقسمتی ملاحظہ کیجئے کہ اتنا اہم واقعہ اور کتابِ عشق کا ایک سنہری باب آج تک پاکستانی قوم کی نگاہوں سے پوشیدہ رہا۔ یہ غازی یہ شہید تو ہمارے محسن تھے مگر ہم نے شامتِ اعمال سے انہیں بھلا دیا۔ غازی امیر احمد شہیدؒ اور غازی عبداللہ شہیدؒ کے بارے میں ایک مضمون ماہنامہ "ضیائے حرم" بھیرہ کے پرچے میں نظر سے گزرا تھا۔ اسے جناب ضیا جالوی صاحب نے ترتیب دیا۔ چونکہ ان کے علم میں کوئی ٹھوس معلومات نہ تھیں اس لیے سنی سنائی باتوں کو ہی الفاظ پہنا گئے۔ عجیب اتفاق ہے کہ آج تک مذکورہ شہیدانِ رسالت کا مولد و مسکن پشاور لکھا جاتا رہا ہے۔ حالانکہ پشاور شہر سے ان کا کسی طرح کا کبھی کوئی تعلق نہیں رہا۔ لاہور کے یہ دونوں حریّت پرور اور بطلِ حمیّت زندہ دلانِ لاہور کی خصوصی توجہ کے مستحق ہیں۔ یہ خوش قسمت شہدانِ رسالت شہرت و ناموری کے ہرگز محتاج نہیں۔ ان کا صلہ تو بہت اعلیٰ و افضل ہے مگر ہمیں اپنی بے جہتی و بے حسی پر نادم ہونا چاہیے وگرنہ ہمارا انجام ایسے لوگوں سے قطعاً مختلف نہ ہوگا جن کی تاریخ محفوظ رہتی ہے نہ جغرافیہ ———

یہ اعزاز بندۂ احقر کے حصّے میں آیا ہے کہ مندرجہ بالا دو شہیدانِ رسالت پر مکمل اور صحیح تناظر میں تعارفی مضمون پہلی بار زیورِ طبع سے آراستہ ہو رہا ہے (الحمدللہ) پہلے یہ موضوع اہلِ قلم کی بے توجہی کا شکار رہا۔ اس کے لیے راقم الحروف سید عابد حسین شاہ موضع بھُمبی (چکوال) کی کرمفرمائی پر تہِ دل سے ممنونِ احسان ہے۔

شہیدانِ ناموسِ رسالتؐ کا پیغام

ناموسِ مصطفیٰؐ پہ دل وجان وار دو
گستاخ کو جو دیکھو، بلا خوف مار دو
شان وشکوہِ خواجۂ گیہاں پہ مر مٹو
حُسن و جمالِ ملتِ بیضا نکھار دو
ہر شاتم ولعین کا گھر بار پھونک دو
اس پاک سرزمین کا نقشہ سنوار دو
دل سے کبھی تو فرضِ عقیدت ادا کرو
سر سے کبھی تو قرضِ محبت اتار دو
عشقِ رسولؐ مخزنِ کیف ونشاط ہے
دشتِ دل و نظر کو پیامِ بہار دو
سرکارؐ کے وقار پہ آئے نہ کوئی حرف
عمرِ عزیز بس اسی دُھن میں گزار دو

——— فیض الرسول فیضان (گوجرانوالہ)

تحفظِ ناموسِ رسالتؐ کی چند گم شدہ کڑیاں

شخصیات و واقعات

تحریر: رائے محمد کمال

میں نے بچپن کے دائرے سے نکلتے ہی یہ خواب دیکھا تھا کہ پاکستان کی فضائیں نعتِ رسول مقبول (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے معمور ہوں۔ نوکِ قلم سے سرکار (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی بات ہی کیا؟ جنہوں نے اس مقدس فریضہ کی تکمیل خونِ جگر سے کی۔ اس لحاظ سے ملتِ اسلامیہ بجا طور پہ فخر کرسکتی ہے کہ انہوں نے اپنے آقا و مولا (صلی اللہ علیہ وسلم کی بارگاہ ناز میں ہمیشہ ہر دو طرح سے نعتیہ نذرانے پیش کیے ہیں۔ برصغیر پاک وہند کی سرزمین پر یہ عمل جس خلوصِ نیت، ذوق وشوق اور والہانہ شیفتگی کے ساتھ نبھایا گیا، اس کی کہیں مثال نہیں ملتی۔ ہندوستانی مسلمانوں نے ایسی عظیم الشان اور ایمان افروز روایات قائم کیں کہ سبحان اللہ!۔ بحمداللہ مجھے یہ شرف حاصل ہوا کہ حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے ان نعت گوؤں کا تذکرہ قلمبند کروں جن کے عشقِ رسول (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) پہ آج بھی مقتل کی دیواریں گواہ ہیں اور جنہوں نے اپنے خون کے قطروں سے ثنائے رسول (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) میں ایک ایک روح افزا بند لکھا۔ ایسے ہی مدحت گران پیغمبر (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) میں غازی عبدالرشید شہیدؒ، غازی عبدالقیوم شہیدؒ غازی میاں محمد شہیدؒ، غازی محمد عبداللہ شہیدؒ۔ غازی مرید حسین شہیدؒ، غازی علم الدین شہیدؒ، غازی محمد صدیق شہیدؒ اور غازی امیر احمد شہیدؒ وغیرہم کے اسمائے گرامی تابندہ و پائندہ ہیں۔ علاوہ ازیں چند ایک گمنامی کے پردہ میں رہے۔ ملت اسلامیہ کے اہلِ قلم نے ان سے عدم توجہی روا رکھی۔ قومی سطح پر اعترافِ حقیقت تو بڑی بات تھی، انفرادی طور پر بھی کسی قابلِ ذکر جوش وخروش کا مظاہرہ نہ ہوا ——— راقم الحروف مذکورہ بالا شہیدانِ ناموسِ رسالت کے حالات وواقعات اور غیرت ایمانی سے متعلق مختلف

جرائد و رسائل بھی جامع مضامین لکھ چکا ہے ۔ زیرِ نظر سطور میں شمعِ رسالت کے ان پروانوں کا ذکر ہو گا جو عام طور پر فراموش کیے جا چکے ہیں اور نئی نسل ان کے نام اور کام سے قطعاً بے خبر ہے ۔ اس تاریخی سلسلے کی چند کڑیاں مندرجہ ذیل ہیں ۔

(۱)

غازی محمد منیر شہیدؒ ، موضع موگہ ضلع فیروز پور (بھارتی پنجاب) کے ویٹنری ہسپتال میں بلحاظِ پیشہ چپراسی تھے ۔ مگر جذبۂ عشقِ رسول (صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم) سے سرشار ایک موقع پر تحفظِ ناموسِ نبی (صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم) کے لیے آگے بڑھے اور جان پر کھیل گئے ۔ شاتمِ رسولؐ کو واصل فی النار کرنے کے بعد عدالتی فیصلے کی رو سے انہیں سزائے موت کا مستحق گردانا گیا ۔ وہ جامِ شہادت کے متمنی تھے اور سرِ دار لٹک کر لافانی نسخۂ حیات بتا گئے ۔

دنیائے صحافت میں شہیدِ موصوف کا تعارف غالباً کیپٹن ممتاز ملک صاحب کے ایک مضمون بعنوان " نوجوانانِ اسلام کی حرمت و شان " سے ہوا ۔ انہوں نے جنوری ۱۹۷۳ء میں نوائے وقت کے پرچوں میں شہیدانِ رسالت کا مختصر تذکرہ قلمبند کیا تھا ۔ تاہم ان کے نقشِ قدم کا کھوج غازی میاں محمد شہیدؒ کے برادرِ حقیقی ملک نور محمد صاحب کی کمال مہربانی سے ملا ۔

(۲)

غازی عبدالعزیزؒ / غازی خدا بخش اکو جھاؒ ——— راجپال مردود پر سب سے پہلے ۲۶ ستمبر ۱۹۲۷ء کی صبح غازی خدا بخش اکو جھاؒ نے قاتلانہ حملہ کیا ۔ یہ سرفروش اندرون بکی گیٹ لاہور کا رہنے والا تھا ۔ باپ کا نام محمد اکبر اور اس کا تعلق ایک معروف کشمیری خاندان سے تھا ۔ اس کو سات سال قید سخت جس میں تین ماہ کی قیدِ تنہائی بھی شامل تھی ، سزا کا حکم سنایا گیا ۔

چونکہ راجپال نامی ، گستاخِ رسولؐ بچ رہا تھا اس لیے ۹ / اکتوبر ۱۹۲۷ء کی شام کو

غازی عبدالعزیزؒ ایک غیور پٹھان نے قسمت آزمائی کی ۔ مذکور نوجوان رمضنہ علاقہ غزنی افغانستان کا رہنے والا تھا اور بالغرض تجارت ہندوستان چلا آیا تھا ۔ لاہور میں آریہ سماجی کتب فروش پر جھپٹا مگر اپنے مقصد میں ناکام رہا ۔ اقدامِ قتل کے سبب انہیں سات سال قید سخت کی سزا دی گئی ۔ ازاں بعد اس فتنے کا سدِ باب غازی علم الدین شہید علیہ الرحمۃ کے ہاتھوں ہوا ۔

(۳)

غازی محمد حنیف شہیدؒ نے اپنی بے مثال وفاؤں کا باب مسلم ریاستی دار الحکومت "بھوپال" میں رقم کیا ۔ کہا جاتا ہے ، وسطِ ہند کے اس تہذیبی شہر میں ایک گرلز ہائی سکول کی انگریز ہیڈ مسٹریس نے سوجھی سکیم کے تحت مدرسے کی صفائی کے بہانے قرآنِ کریم کے بوسیدہ اوراق ایک ہندو "جمعدارنی" کے ہاتھوں کوڑے میں ڈلوائے اور جب اس پر احتجاج کیا گیا تو اُس بدزبان و بدنصیب عورت نے قرآنِ پاک ، دینِ متین اور پیغمبرِ اسلام (صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم) کے بارے میں نازیبا اور اشتعال انگیز الفاظ کہے ۔ بھوپال کے ایک غیرت مند نوجوان محمد حنیف نے جو پیشے کے اعتبار سے قصاب تھے ۔ اس انگریز عورت کو راستے میں روک لیا اور اس سے کہا کہ وہ اپنی اس ناپاک جسارت اور شیطانی حرکت پر شہر کے مسلمانوں سے معافی مانگے اور اعلانِ توبہ کرے ۔ حکومت کے نشے میں چور اس بنتِ ابلیس نے یہ مطالبہ ٹھکرا دیا اور مجاہدِ ملت کے ہاتھوں انجام کو پہنچی ۔ غازی محمد حنیفؒ اس غلط کار عورت کو کیفرِ کردار تک پہنچا کر تھانے میں حاضر ہو گئے ۔ اقبالِ فعل کیا اور تمام عدالتوں میں اعترافِ حقیقت فرمایا ۔ کچھ عرصہ جیل میں گزرا مقدمہ کی سماعت ہوئی اور محمد حنیف غازیؒ کو پھانسی کی سزا سنا دی گئی اور " الصلوٰۃ و السلام علیک یا سیدی یا رسول اللہ " کا ورد فرماتے ہوئے تختۂ دار پر جھول گئے ۔

غازی موصوفؒ سے متعلق چند تعارفی جملے سہ ماہی " صدف " (پاکستان نمبر)

جنوری تا مارچ ۱۹۸۴ء سے ص ۳۹ میں شائع ہوتے۔ مضمون نگار محترمہ فرزانہ اسد صاحبہ تھیں۔ اس کی فراہمی پر ہم محسن دوست عبدالغفار شیخ صاحب (سینیئر مکینیکل آفیسر) کوٹڑی سندھ کے تہِ دل سے ممنونِ احسان ہیں)

(۴)

ضلع گجرات کے معروف قصبہ منڈی بہاء الدین سے نزدیکی گاؤں "آہلہ" میں بھی ایک سکھ گستاخِ رسول کو جہنم رسید کیا گیا تھا۔ قاتل کا نام غازی محمد اعظم تھا جو بفضلہٖ تعالیٰ بقیدِ حیات ہیں۔ بناء بریں سرگودھا روڈ پر واقع پنڈی بھٹیاں کے علاقہ میں ذخیرہ بیرانوالہ سے ملحقہ بستی چک کوکارہ میں بھی اس طرز کا ایک تاریخی واقعہ پیش آیا۔ قاتل مقتول ہم جماعت تھے۔ ہندو طالب علم نے شانِ رسولؐ (صلی اللہ علیہ وسلم) میں گستاخی کا ارتکاب کیا اور مسلمان مجاہد نے نہایت سوچ سمجھ کر اُسے موت کے گھاٹ اتار دیا۔ کم عمری کی بنا پر عدالتی سزا سے بچ نکلے اور بفضلہٖ تعالیٰ زندہ ہیں۔

(۵)

پکّا قلعہ حیدر آباد (سندھ) میں قیامِ پاکستان سے فقط ایک برس قبل (۱۹۴۶ء) ہندو جن سنگھیوں کا ایک بڑا اجتماع ہوا تھا۔ اس میں آٹھ دس ہزار ہندو شریک تھے۔ مذکورہ جلسے میں ملتِ اسلامیہ کو نہ صرف غلیظ گالیاں دی گئیں بلکہ ان کے ایک گرو نینوں مہاراج نے نبی اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی شانِ مبارک میں بھی گستاخانہ باتیں کیں۔ اس بات نے تین نمبر تالاب کے مسلمان نوجوانوں کو بے تاب کر دیا۔ جب یہ پچیس نوجوان حرمتِ نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) پر اپنی جانیں نچھاور کرنے کا جذبہ لیے قلعہ پر حملہ آور ہوتے اور نعرۂ تکبیر بلند کیا تو جلسے میں بھگدڑ مچ گئی۔ عاشقانِ مصطفیٰ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے بے تحاشا ڈنڈے اور لاٹھیاں برسانا شروع کر دیں۔ اسی اثنا میں نینوں مہاراج' ایک جوشیلے نوجوان عبدالخالق قریشی ولد محمد ابراہیم قریشی کے سامنے آگیا۔ نوجوان نے اس

بے غیرت ملیچھ کے پیٹ میں چھُرا گھونپ دیا۔ وار کاری ثابت ہوا اور شاتمِ رسولؐ اپنے ہی پیروکاروں کے درمیان تڑپ تڑپ کر جہنم رسید ہوگیا۔ جن سنگھی بدحواس ہو کر اپنی لاٹھیاں، جوتیاں، تلواریں اور دوسرے ہتھیار چھوڑ کر بھاگ کھڑے ہوئے اس واقعے میں حصہ لینے والے چند معلوم خوش قسمت اشخاص مندرجہ ذیل ہیں۔ حاجی محمد بخش عرف ممو شیدی، اللہ ورایو شیدی، محمد علی شیدی، علی مراد شیدی، لکھانو دایو، صدیق گودنہ، نبی بخش عرف بنو، میر محمد عرف میرل، اللہ ڈنو شیدی۔ رحیم بخش، ابراہیم حجام عبدالخالق قریشی۔ لالہ مجیدی پشوری۔

(۶)

گستاخ آریہ سماجی "لیکرام" کو بھی کسی نامعلوم مسلمان نے نزگباش کیا۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ مرزا قادیانی نے بھی اس ملعون کی ہلاکت کی پیشگوئی بعض مصلحتوں کے پیشِ نظر داغی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ پولیس کی تفتیش میں مرزا قادیانی پر تحریکِ قتل اور اعانت کا شبہ ہوا اور اس کی خانہ تلاشی بھی لی گئی مگر کوئی ثبوت بہم نہ پہنچ سکا۔ حقیقتِ حال یہ ہے کہ اس مردود کا قاتل بھی کوئی مسلمان ہی ہو سکتا ہے۔ مرزائیوں کا تحفظِ ناموسِ رسالت سے کیا واسطہ؟ وہ تو خود تحریک شاتم رسولؐ کی ایک کڑی ہیں۔ الغرض مرزا قادیانی کی پیشگوئی اس سوچ کا تجرباتی مظہر نظر آتی ہے کہ غیرتمند مسلمان اس ناپاک وجود کو برداشت نہیں کر سکیں گے۔ لہٰذا کیوں نہ الہامی دعویٰ آزمالیں۔

(۷)

۴ اپریل ۱۹۳۵ء کو ہندوستان کے مسلم اخبارات میں یہ خبر چھپی کہ یکم اپریل کو بمبئی میں ایک باغیرت مسلمان ...... نے ایک ہندو ...... کو ہلاک کر دیا اور پولیس کے سامنے بیان دیا کہ مقتول نے ایک مقامی ورنیکلر اخبار میں حضرت رسول اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی عکسی تصویر شائع کر کے اس کے جذبات مجروح کیے تھے۔

۲۸ ر اپریل ۱۹۳۵ء کے روز ایک اور خبر نمایاں تھی کہ مسلمان شہر میں ۱۴ ر اپریل کو سات بجے شام مسمی "ویربھان" آریہ سماج نے حضور ختمی مرتبت آقائے دوجہاں (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی شان میں گستاخانہ الفاظ استعمال کیے۔ آج بعد دوپہر آریہ سماجی مذکور کو ساڑھے تین بجے گلی گردھاری لال اندرون پاک دروازہ میں کسی نامعلوم شخص نے پیٹ میں چھرا اتار کر ہلاک کر دیا۔ شبۂ قتل میں محمد بخش چوب تراش، حاجی فیض بخش، حاجی عبداللہ اور الٰہی بخش کو گرفتار کر لیا گیا۔ ازاں بعد عدم ثبوت کی بنا پر عدالت سے رہا ہوئے۔

(۹)

جہلم شہر میں دریا کے کنارے واقع شمالی محلہ کے ایک مسلمان غازی غلام محمد شہیدؒ کی سرگزشت بھی قابلِ ذکر ہے۔ ان کے مقدر جاگنے کی تفصیل کچھ یوں ہے: "شہنشاہِ دوعالم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی ولادتِ باسعادت کا مبارک دن تھا۔ ہر طرف خوشیوں نے ڈیرے ڈال رکھے تھے۔ کائنات کی نعمتِ کبریٰ کے ورودِ مسعود پر کون شکر ادا نہ کرتا۔ اس روز بھی اللہ تعالیٰ کے اس احسان عظیم پر پوری ملتِ اسلامیہ سربسجود تھی۔ اظہارِ مسرت کے طور پر عید میلاد کا ایک جلوس تشکیل دیا گیا۔ فرزندانِ توحید کا یہ قافلہ مذکورہ بالا شہر کے کسی چوراہے سے گزر رہا تھا۔ قریب ہی سکھوں کی آبادی تھی۔ سکھ مت کا ایک آوارہ پیروکار آوازے کسنے لگا۔ یہ مجاہد اس کے نزدیک کھڑا تمام اوچھی حرکات دیکھ رہا تھا۔ اسی اثنا میں جلوس کے پیچھے گدھے پر سوار کوئی لڑکا دکھائی دیا۔ اب کے وہ انتہائی گمراہ کن و لرزہ خیز الفاظ بک رہا تھا۔ اس نے زور سے چلّا کر کہا "وہ دیکھو مسلمانوں کا نبی، براق پر چڑھ کر آگیا ہے"۔ ان سے رہا نہ گیا، بعجلت اس کے سامنے جا کھڑے ہوئے اور کہا "بے غیرت کتے اپنی زبان کو قابو میں رکھ، ورنہ تجھے ٹکڑے ٹکڑے کر کے رکھ دوں گا"۔ مگر وہ اپنی ذلیل حرکتوں سے باز نہ آیا۔ غازی غلام محمدؒ

نے غصہ کی حالت میں اپنا چاقو اس کے سینے میں جھونک دیا اور پے در پے وار کیے۔ بجرم قتل آپ کی گرفتاری عمل میں آئی۔ عدالت میں مقدمہ چلا اور انہیں سزائے موت کا مستحق ٹھہرایا گیا۔ آپ جنازگاہ جہلم کے قریب مشہور قبرستان میں مدفون ہیں۔

(۱۰)

پچھلے دنوں ماہنامہ "ضیائے حرم"، لاہور میں راقم الحروف کا ایک مضمون "غازی منظور حسین شہیدؒ" شائع ہوا۔ تمام نفسِ مضمون مولانا قاضی مظہر الدین صاحب (چکوال) کے انٹرویو پر مبنی تھا۔ اس کی اشاعت پر حاجی ملک محمد حسین صاحب، سہگل آباد، چکوال کا ایک تفصیلی خط ملا۔ انہوں نے نہایت ذمہ داری اور سیاق و سباق سے حقیقتِ حال قلمبند کی۔ لکھا تھا کہ مولانا کرم الدین آف بھیں کے صاحبزادہ اور قاضی مولانا مظہر الدین صاحب کے برادرِ اکبر مولانا منظور حسین مرحوم کا شہیدانِ رسالت سے کسی قسم کا کوئی تعلق نہ ہے اور نہ ہی وہ تحفظِ ناموسِ نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) پر نچھاور ہوئے۔ قبضۂ زمین کے سلسلہ میں لڑائی ہوئی اور ان کے ہاتھوں ایک مسلمان کا قتل سرزد ہو گیا۔ ازاں بعد ایس ڈی او کی عدالت میں تفتیشی پیشیوں کے دوران ایس ڈی او نے ان کو بُرا بھلا کہا۔ اس بے عزتی کو وہ برداشت نہ کر سکے اور انتقاماً ہندو مذکور کو موت کے گھاٹ اتار دیا۔ اس نے اپنی زبان سے گستاخیٔ رسولؐ کا کوئی لفظ نہ کہا تھا اور مولانا صاحب بھی اس جذبے کے تحت قتل میں ملوث نہ ہوتے"۔

بندۂ ناچیز نے بغرض تحقیق محترم جناب ملک صاحب کے خط کی ایک فوٹو کاپی مولانا قاضی مظہر الدین کی خدمت میں ارسال کی۔ اس لیے کہ واقعات و حالات کے وہی راوی تھے۔ جواباً پہلے تو ان کے ایک خلیفہ صاحب نے ملک صاحب پر غصہ جھاڑا۔ تاہم موضوع سے متعلق وضاحت نہ فرمائی گئی۔ پھر حضرت مولانا صاحب نے بقلم خود احقر کو مکتوبِ گرامی تحریر فرمایا، لکھتے ہیں: "آپ نے جو لکھا ہے کہ، راقم الحروف کو پہلی دفعہ ملک عبدالکریم صاحب (ہنڈی بھٹیاں) نے بتایا کہ ایس ڈی او مذکور گستاخیٔ رسولؐ

کا مرتکب ہُوا تھا اور غازی ممدوح کے برادرِ حقیقی قاضی منظر حسین صاحب نے
استفسار پر اس کی تصدیق فرمائی، "یہ صحیح نہیں ہے بلکہ آپ کو غلط فہمی ہوئی ہے۔
میں نے یوں نہیں کہا۔ ایس ڈی او کھیم چند سے برادرم منظور حسین صاحب شہیدؒ
کی مخالفت پہلے سے تھی" ـــــ بنا بریں انھوں نے ذاتی پرخاش اور خاندانی جائداد
کے قضیہ کا بھی اعتراف فرمایا۔ چونکہ مولانا صاحب تردید فرما رہے ہیں لہٰذا اسے میری
غیر ذمہ داری کہیے کہ خواہ مخواہ ایک شخص کو شہیدانِ ناموسِ رسالت کی صف میں لا کھڑا کیا
اور ریکارڈ میں سخت غلطی واقع ہو گئی۔ اب میں اس معاملہ کو اپنی خطا گردانتا ہوں۔
حقیقت یہ ہے کہ قاضی مولانا منظور حسین صاحب غازی علم الدین شہید و غازی مرید حسین
شہید کے قافلے میں شامل نہیں ہیں۔

قرآنِ حکیم کی مقدس آیات اور احادیثِ نبویؐ آپ کی دینی معلومات میں
اضافے اور تبلیغ کے لیے شائع کی جاتی ہیں۔ اِن کا احترام آپ پر فرض
ہے۔ ماہنامہ **نعت** کا ہر صفحہ حضورِ سرورِ کائنات علیہ السلام والصلوٰۃ
کے ذکرِ مبارک سے مزیّن ہے۔ لہٰذا ماہنامہ **نعت** کو صحیح اسلامی
طریقے کے مطابق بے حرمتی سے محفوظ رکھیں۔

حلقۂ درودِ پاک

۱۲ ربیع الاوّل ۱۴۱۱ھ کو ایڈیٹر نعت کے گھر (اظہر منزل نیو شالامار کالونی ملتان روڈ لاہور) میں ایک محفلِ درود و نعت منعقد ہوئی جس میں فیاض حسین چشتی نظامی نے تجویز پیش کی کہ ہر قمری مہینے کی بارہویں تاریخ کو احباب کسی ایک دوست کے ہاں اکٹھے ہوں اور حلقے کی صورت میں درود و سلام کے پھول بارگاہِ مصطفوی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) میں پیش کیے جائیں۔

چنانچہ ۱۲ ربیع الثانی کو راجا رشید محمود کے ہاں ۱۲ جمادی الاوّل کو پروفیسر حافظ خلیل احمد نوری کے گھر (واقع وارث کالونی نزد ملتان روڈ چونگی، لاہور) ۱۲ جمادی الآخر کو فیاض حسین چشتی نظامی کے گھر (واقع علی ہاؤس مسلم ٹاؤن لاہور) ۱۲ رجب کو راجا رشید محمود کے ہاں اور ۱۲ شعبان المعظم کو شاہ اُست خان کی قیام گاہ (واقع شاہراہ قائدِ اعظم، لاہور) پر احباب جمع ہوئے اور آقا حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے دربارِ گہر بار میں ہدیہ درود و سلام پیش کیا گیا۔ یہ محفل ہر قمری مہینے کی بارھویں کو ۳ بجے بعد دوپہر شروع ہو کر نمازِ مغرب کے وقت اختتام پذیر ہوتی ہے۔ تمام احباب خاموشی سے جو درودِ پاک چاہتے ہیں، پڑھتے ہیں۔ اگر محفل میں کوئی معزز نعت خواں موجود ہوں تو وہ نعت خوانی کی سعادت حاصل کرتے ہیں۔ عام طور ان محفلوں میں سید محمد رضا زیدی سے نعتیں سنی جاتی رہیں۔

اِن شاء اللہ ۱۲ رمضان المبارک کو ۳ بجے سہ پہر یہ محفل تسنیم الدین احمد کے زیرِ اہتمام جامع مسجد عکس گنبدِ خضرا، شاہراہِ قائدِ اعظم لاہور میں ہو گی اور ۱۲ شوال المکرم کو پروفیسر حافظ خلیل احمد نوری خطیب جامع مسجد وارث کالونی، نزد چونگی ملتان روڈ لاہور کے ہاں۔

قارئین کرام سے استدعا ہے کہ اگر ان کے دل اس وظیفۂ خداوندی کو اس انداز میں ادا کرنے پر مائل ہوں تو کام کو آگے بڑھائیں۔ اپنے حلقۂ احباب یا حلقۂ قرابت میں اس طرح کے حلقہ ہائے درود و نعت کا اہتمام کریں۔
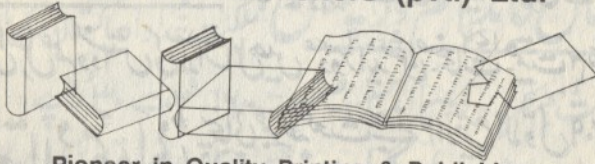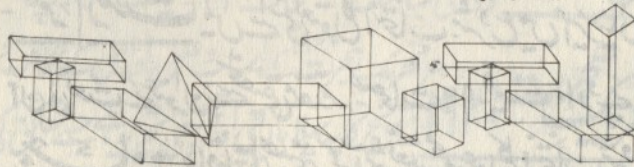
ایڈیٹر نعت کی چند مطبوعات

ایڈیٹر "نعت" کی بیس سے زیادہ تصانیف / تالیفات شائع ہو چکی ہیں۔ ان میں سے مندرجہ ذیل کتابیں دستیاب ہیں ـــــ

۱۔ **حدیثِ شوق** دُوسرا مجموعہ جس میں ۸۷ نعتیں ہیں۔ آخر میں ایڈیٹر "نعت" کی نعتیہ شاعری کے بارے میں اہلِ علم و دانش کی آرا شامل ہیں۔ دُوسرا ایڈیشن صفحات ۱۷۶۔ قیمت ۴۲ روپے

۲۔ **نعتاں دی ڈالی** پنجابی مجموعۂ نعت جسے ۱۲ ربیع الاوّل ۱۴۰۹ھ کو صدارتی ایوارڈ دیا گیا۔ کتاب میں ۶۳ نعتیں ہیں۔ "حدیثِ شوق" کی طرح اس مجموعے میں بھی حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے لیے "تو" یا "تم" کا صیغہ استعمال کرنے کی جسارت نہیں کی گئی۔ صفحات ۱۴۴۔ قیمت ۳۰ روپے

۳۔ **قُلزمِ رحمت** امیر مینائی کے مجموعۂ نعت "محامدِ خاتم النبیین" صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں سے اسّی نعتوں کا انتخاب۔ شروع میں امیر مینائی اور اُن کی نعت کے عنوان سے تحقیقی مقدّمہ۔ صفحات ۹۶۔ قیمت ۱۰ روپے۔

۴۔ **نعتِ حافظ** حافظ پیلی بھیتی کے آٹھ نعتیہ مجموعوں کا انتخاب شروع میں "حافظ اور کلامِ حافظ" کے عنوان سے ۳۵ صفحات کا مقدّمہ۔ صفحات ۲۸۰۔ قیمت ۷۵ روپے ـــــ

۵۔ **میرے سرکار** صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سیرۃ النبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے مختلف موضوعات پر ایڈیٹر "نعت" کے فکر انگیز اور بصیرت افروز مضامین کا مجموعہ۔ صفحات ۱۴۴ قیمت ۱۸ روپے

۶۔ **احادیث اور معاشرہ** حُسنِ معاشرت کے بارے میں آقا حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تیس احادیثِ مُبارکہ کی تشریح۔ دُوسرا ایڈیشن۔ صفحات ۱۵۲۔ قیمت ۱۸ رُوپے

۷۔ **ماں باپ کے حقوق** کتاب ۱۷ ابواب پر مشتمل ہے۔ کتاب کی تالیف میں ۷۰ سے زیادہ کتابوں سے استفادہ کیا گیا ہے۔ اپنے موضوع پر حرفِ آخر کی حیثیت رکھتی ہے۔ صفحات ۱۱۲۔ قیمت ۲۱ رُوپے

۸۔ **اقبالؒ، قائدِ اعظمؒ اور پاکستان** بانئ پاکستان، حکیم الامّت اور مملکتِ خُداداد پاکستان کے بارے میں نہایت اہم تحریر۔ دُوسرا ایڈیشن۔ صفحات ۱۶۰۔ قیمت ۳۰ رُوپے۔

۹۔ **اقبالؒ و احمد رضاؒ۔ مدحتِ گرانِ پیغمبر** صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم علّامہ اقبالؒ اور مولانا احمد رضا خاں بریلویؒ کی قدرِ مشترک عشقِ رسُول علیہ التحیۃ والتسلیم پر ایک جامع تحریر۔ تیسرا ایڈیشن۔ صفحات ۱۱۲۔ قیمت ۱۰ رُوپے

۱۰۔ **راج دُلارے** بچوّں کیلیے ایڈیٹر "نعت" کی نظمیں۔ دُوسرا ایڈیشن۔ دو رنگی طباعت۔ صفحات ۹۶۔ قیمت ۱۸ رُوپے

۱۱۔ **تحریکِ ہجرت ۱۹۲۰ء** تحریکِ ہجرت ۱۹۲۰ء کے اسباب و علل اور اس کے عواقب و نتائج کا یہ پہلا تاریخی اور تحقیقی تجزیہ ہے جسے حقائق کی روشنی میں دیکھا اور پرکھا گیا ہے۔ دُوسرا ایڈیشن۔ صفحات ۴۶۴۔ قیمت ۸۵ رُوپے

۱۲۔ **منشورِ نعت** اردُو اور پنجابی نعتیہ فردیات کا مجموعہ۔ صفحات ۱۷۶۔ قیمت ۵۰ روپے

آپکو جن کتابوں کی ضرورت ہوں اُن کی قیمت بھیج دیں کتابیں فوراً بھیج دی جائیں گی

اخترِ کتاب گھر اظہر منزل۔ نیو شالامار کالونی مُلتان روڈ ۔ لاہور

ایڈیٹر نعت کی نئی تالیفات

حمد و نعت

مضامین : اسلام میں توحید کا تصور۔ حمد حامد اور محمود۔ احادیث میں حمدِ خداوندی۔ حمدیہ شاعری میں ذاتی حوالہ۔ بارگاہِ خداوندی میں ملّت کی فریاد۔ حمد اور نعت کا تعلق۔ حمد میں نعت کی صورتیں۔ قرآنِ مجید میں نعت صحابۂ کرامؓ اور نعت۔ نعت کیا ہے۔ نعت کی تعریف۔ نعت میں احترامِ رسالت کے تقاضے آشوبِ عصر اور نعت۔ نعت میں شمائل و فضائل کا بیان۔ نعت میں اظہارِ عجز۔ نعت میں افتخار کی صورتیں —— ۲۹ حمدیں (جن میں نعت بھی ہے) اور "نعت کیا ہے" کے موضوع پر ۲۰ نظمیں اور حمد کے موضوع پر اب تک شائع ہونے والی کتابوں کا تعارف

۲۰۸ صفحات — مضبوط جلد — خوبصورت چار رنگا گرد پوش — قیمت : ۴۸ روپے

میلاد النبی صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم

یومِ ولادتِ سرکارؐ ۱۲ ربیع الاول یا ۹ ربیع الاول (ایک تحقیقی مقالہ) ظہورِ قدسی (نعتیہ نثر پارے) مستانہ بزمِ مولود (خواجہ حسن نظامی کی اچھوتی تحریر) محافلِ میلاد (تاریخی و تحقیقی جائزہ) عربی مولود نامے ، حیاتِ طیبہ میں ربیع الاول کی اہمیت (سیرت النبیؐ کا نیا رُخ) قبۂ مولد النبیؐ ، میلاد کا فلسفہ —— اور دوسرے مضامین کے علاوہ ۸۰ کے قریب میلادیہ نعتیں۔ ۳۳۶ صفحات۔ خوبصورت اور مضبوط جلد جاذبِ نظر گرد پوش۔ قیمت ۷۲ روپے

مدینۃ النبی صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم

مدینۂ طیبہ کی فضیلت و فوقیت۔ مدینۃ الرسولؐ کے اسمائے مقدسہ۔ مدینہ، تاجدارِ مدینہ کی نظر میں۔ زیارتِ مدینہ کی اہمیت۔ مدینۂ منورہ میں حاضری کی تمنا۔ سرکارؐ کا شہر۔ "مدینہ شناسی"۔ روضۂ سرکارؐ۔ زیارتِ روضۂ اطہر کی خواہش معنیٔ محبت اور حدودِ نیت۔ تاریخ و آثارِ مدینہ۔ مدینہ، سرزمینِ محبت۔ مدینہ سفرناموں کی روشنی میں، اردو شاعری اور مدینۂ طیبہ۔ نفس گم کردہ می آید جنید و بایزید ایں جا۔ پنجابی نعت میں مدینۃ الرسولؐ کا ذکر ان مضامین کے علاوہ مدینۃ النبیؐ پر ۲۹ نظمیں اور "مدینہ" ردیف کی ۲۸ نعتیں۔

۲۰۸ صفحات — مضبوط جلد — دیدہ زیب گرد پوش —— قیمت : ۴۸ روپے

مکتبۂ ایوانِ نعت رجسٹرڈ
نزد جامع مسجد سُنی رضوی
نیو شالامار کالونی، ملتان روڈ۔ لاہور

ماہنامہ "نعت" لاہور

۱۹۸۸ء کے خاص نمبر

- جنوری ــــــ حمدِ باری تعالیٰ
- فروری ــــــ نعت کیا ہے
- مارچ ــــــ مدینۃ الرسول صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم (حصہ اوّل)
- اپریل ــــــ اردو کے صاحبِ کتاب نعت گو (حصہ اوّل)
- مئی ــــــ مدینۃ الرسول صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم (حصہ دوم)
- جون ــــــ اردو کے صاحبِ کتاب نعت گو (حصہ دوم)
- جولائی ــــــ نعتِ قدسی
- اگست ــــــ غیر مسلموں کی نعت (حصہ اوّل)
- ستمبر ــــــ رسولِ نمبروں کا تعارف صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم (حصہ اوّل)
- اکتوبر ــــــ میلاد النبی صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم (حصہ اول)
- نومبر ــــــ میلاد النبی صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم (حصہ دوم)
- دسمبر ــــــ میلاد النبی صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم (حصہ سوم)

ماہنامہ نعت لاہور کے ۱۹۸۹ء کے خاص نمبر

جنوری	— لاکھوں سلام (حصہ اوّل)
فروری	— رسول نمبروں کا تعارف (حصہ دوم)
مارچ	— معراج النبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم (حصہ اوّل)
اپریل	— معراج النبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم (حصہ دوم)
مئی	— لاکھوں سلام (حصہ دوم)
جون	— غیر مسلموں کی نعت (حصہ دوم)
جولائی	— کلامِ ضیاء (علامہ ضیاء القادری) حصہ اوّل
اگست	— کلامِ ضیاء (حصہ دوم)
ستمبر	— اُردو کے صاحبِ کتاب نعت گو (حصہ سوم)
اکتوبر	— دُرود و سلام (حصہ اوّل)
نومبر	— دُرود و سلام (حصہ دوم)
دسمبر	— دُرود و سلام (حصہ سوم)

ماہنامہ نعت لاہور ۱۹۹۰ء کے خاص نمبر

- جنوری ـــــ حسن رضا بریلوی کی نعت
- فروری ـــــ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نمبروں کا تعارف (حصہ سوم)
- مارچ ـــــ دُرود و سلام (حصہ چہارم)
- اپریل ـــــ دُرود و سلام (حصہ پنجم)
- مئی ـــــ دُرود و سلام (حصہ ششم)
- جون ـــــ غیر مسلموں کی نعت (حصہ سوم)
- جولائی ـــــ اُردو کے صاحبِ کتاب نعت گو (حصہ چہارم)
- اگست ـــــ وارثیوں کی نعت
- ستمبر ـــــ آزاد بیکانیری کی نعت (حصہ اوّل)
- اکتوبر ـــــ میلاد النبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم (حصہ چہارم)
- نومبر ـــــ دُرود و سلام (حصہ ہفتم)
- دسمبر ـــــ دُرود و سلام (حصہ ہشتم)

ماہنامہ **نعت** لاہور

۱۹۹۱ء کے خاص نمبر

جنوری ——— شہیدانِ ناموسِ رسالت (اول)

فروری ——— " دوم

مارچ ——— " سوم

اپریل ——— " چہارم

مئی ——— عربی ادب میں ذکرِ میلاد

جون ——— غریب سہارنپوری کی نعت

نعت سے متعلق مختلف ایوارڈ

ایوانِ نعت رجسٹرڈ نے فیصلہ کیا ہے کہ مجلسِ سخن رجسٹرڈ کے اشتراک سے ہر سال نعت کے مندرجہ ذیل ایوارڈ جاری کیے جائیں:

۱۔ نعت کے کسی بھی شعبے میں نمایاں کام کرنے والی خاتون کو:
اُمّ المومنین حضرتِ عائشہ صدیقہ رضی ایوارڈ

۲۔ بہترین مجموعۂ نعت پر:
حضرتِ حسان رضی ایوارڈ

۳۔ نعت کے بارے میں بہترین تحقیق کرنے والے کو:
حضرتِ ابوطالب رضی ایوارڈ

۴۔ نعت کے حوالے سے بہترین خطاطی پر:
حضرتِ علی رضی ایوارڈ

۵۔ بہترین انتخابِ نعت پر:
امام مالک ؒ ایوارڈ

۶۔ بہترین نعت پر:
علامہ بوصیری ؒ ایوارڈ

۷۔ سیرت کی بہترین کتاب پر:
ابنِ اسحٰق ؒ ایوارڈ

۸۔ درود و سلام کے موضوع پر سب سے اہم کام کرنے والے کو:
امام شافعی ؒ ایوارڈ

۹۔ مدینہ طیبہ پر بہترین کتاب یا مقالہ لکھنے والے کو:
شہیدی ؒ ایوارڈ

۱۰۔ ایسا بہترین نعت خواں کو، جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خوشنودی کے لیے نعت پڑھتا ہو:
احمد رضا ؒ ایوارڈ

۱۱۔ حضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے ارشادات کی تعمیل میں معاشرتی اچھائیوں کے لیے کام کرنے والے کو: **راجا غلام محمد ؒ ایوارڈ**

• مصنفین/محققین/مؤلفین/شعرا اپنی کتاب کی تین جلدیں ایڈیٹر "نعت" کے نام ارسال کریں۔ • جو حضرات اپنی کتابیں نہ بھیج سکیں، اپنے اور کتابوں کے ضروری کوائف بھیج دیں، ادارہ خود کتابیں حاصل کرنے کی کوشش کرے گا۔ • ان ایوارڈوں کا کوئی مستحق آپ کی نظر میں ہو تو ازراہِ کرم مطلع فرمائیں۔

ایڈیٹر ماہنامہ "نعت" اظہر منزل، نیو شالامار کالونی، ملتان روڈ، لاہور

رجسٹرڈ نمبر ایل ۸۲۹۱

ماہنامہ **نعت** لاہور

شاتمانِ نبیؐ کا مخالف رہوں، جان حرمت پہ سرکارؐ کی وار دوں
جاؤں کر لوں اُنھیں رہبر و رہنما، جو شہیدانِ ناموسِ سرکارؐ ہیں

میرے دل میں نبیؐ کی محبت رہے، دشمنانِ نبیؐ سے عداوت رہے
کر عطا اُن کا جذبہ مجھے اے خدا، جو شہیدانِ ناموسِ سرکارؐ ہیں

رُشدی لعنتی میرے ہاتھوں مرے، یہ سعادت خدایا مجھے بخش دے
ان کا مل جائے محمودؔ کو راستہ، جو شہیدانِ ناموسِ سرکارؐ ہیں

راجا رشید محمود